
UNIVERSITY OF DELHI
निष्ठा धृति सत्यम्

گنج بخش

ولادت ---------------- ۱۰۰۹ء

وصال ---------------- ۱۰۷۲ء

مخدوم علی بن عثمان ہجویری

داتا گنج بخش علیہ



(سوانحی خاکہ)

مرتبہ

محمد وارث کامل



شر .... مطبوعات چٹان لاہور

ابع .... اُردُو پریس لاہور

بت ایک روپیہ چار آنے

ر اوّل .... ایک ہزار

ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را رہنما

[illegible] علیہ الرحمۃ

مطبوعاتِ
چٹان
۸۸
میکلوڈ
روڈ
لاہور



"خدائے بزرگ و بلند نے ہمیں اُس زمانے میں پیدا کیا جب لوگوں نے

- حرص و لالچ کا نام شریعت ---------------- اور
- تکبر و جاہ و ریاست کی طلب کا نام عزت اور علم ------ اور
- ریائے خلق کا نام خوفِ الٰہی ---------------- اور
- دل میں کینہ پوشیدہ رکھنے کا نام حلم ---------------- اور
- لڑائی جھگڑے کا نام بحث مباحثہ ---------------- اور
- ہذیانِ طبع کا نام معرفت ---------------- اور
- نفسانی باتوں اور دل کی حرکتوں کا نام محبّت ---------------- اور
- خدا کے رستے سے منحرف اور بے دین ہونے کا نام فقر ---------------- اور
- حق تعالیٰ اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے کا نام فنا فی اللہ ------ اور
- ترک شریعت کا نام طریقت رکھ لیا ہے۔"

داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ

تصوّف اور اُس کا تاریخی پس منظر

دُنیا کے اِس مادی دَور میں ہر وہ شے جس پر رُوحانیت کی چھاپ ہوتی ہے ٹیڑھی ترچھی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔ اور ایک لمحہ کے لئے بھی یہ سوچنے سمجھنے کی زحمت گوارا نہیں کی جاتی، کہ جس چیز پر ہم ناک بھوں چڑھا رہے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے، کہ ایک مسلمان کی دینی و دُنیاوی زندگی کا اوڑھنا بچھونا یہی اور صرف یہی ہو۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ جس چیز سے ہمیں کراہت آتی ہے وہی ہمارے حق میں بہتر ثابت ہوتی ہے۔ اور جس چیز سے ہمیں لگاؤ ہوتا ہے اُس سے شر کے سوائے اور کوئی نتیجہ بر آمد نہیں ہوتا۔

اگر یہ ایک حقیقت ہے، کہ ایک انسان کو منزلِ زندگی کے ہر موڑ پر ایک ضابطۂ اخلاق کی ضرورت ہے۔ تو لامحالہ ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ جن حضرات نے اِس ضابطہ کی نہایت خوبصورتی کے ساتھ تشکیل کی ہے۔ ان کا مسلک نہ صرف یہ کہ لائق قدر و ستائش ہے۔ بلکہ قابلِ تقلید و اتباع بھی ہے۔ جس مسلک کی

پیروی سے ایک انسان، انسانیت کے اعلےٰ مدارج طے کر سکتا ہے۔ یا جس کے سہارے سیرت کی تربیت اور شخصیت کی تعمیر کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اس کا دوسرا نام عرفِ عام میں تصوّف ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے "تاریخ مشائخ چشت" کے پیش لفظ میں یہ صحیح فرمایا ہے۔ کہ سیرت کی تربیت اور شخصیت کی تعمیر یہ شاید آدمی کے کاموں میں سب سے کٹھن اور سب سے اہم کام ہیں۔ انفرادی زندگی میں بھی، جماعتی زندگی میں بھی۔ انفرادی زندگی کی تکمیل اور یہ کام تو ہم معنی چیزیں ہیں۔ جماعتی زندگی کا سدھار بھی اُن کا طالب ہے۔ اِس لئے کہ جماعتی زندگی کی تعمیر کا لازمی تقاضا ہے۔ کہ معمار خود بھی اپنی تعمیر کرے۔ اس تعمیر کا راستہ یہ معلوم ہوتا ہے، کہ قدرت نے صلاحیتوں اور استعدادوں کی جو گوناگوں اور کبھی کبھی متضاد بخششیں کی ہیں۔ ان میں یکسوئی اور یک جہتی پیدا کی جائے۔ بے ترتیب انفرادیت کو مرتب سیرت بنایا جائے۔ اور اِس سیرت کو جانے بُوجھے بالارادہ اقدار مطلقہ کی چاکری میں لگا کر اخلاقی شخصیت کے مرتبۂ بلند پر پہنچایا جائے۔ خزانۂ کائنات میں اخلاقی شخصیت غالباً سب سے گراں بہا گوہر ہے۔ فرشتے اِس پر رشک کر سکتے ہیں، کرتے ہیں۔ خالق کائنات اپنے اس شاہکار پر ناز کر سکتا ہے، کرتا ہے۔

مغرب زدہ طبقہ کے مادی تصوّرات سے قطع نظر ہمارے علما کا ایک طبقہ بھی تصوّف کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا ہے۔ کاش! اِس طبقہ پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح ہویدا ہو جاتی، کہ تصوّف نام ہے اُس مسلک کا، جس کے پیروؤں کیلئے یہ لازم ہے، کہ وہ کتاب و سُنّت پر سختی کے ساتھ عمل پیرا ہوں۔ اسوۂ رسولؐ اور

صحابہ کے عمل کی روشنی میں قدم اُٹھائیں۔ اوامر و نواہی کی تعمیل میں دن رات مصروف رہیں۔ عبادت کو اپنی زندگی کا اصل الاصول سمجھیں۔ دل میں اگر محبت رہے تو صرف ایک ذات کی۔ دُنیا چاہے اُنہیں جس نظر سے دیکھے۔ لیکن اُن کی لَو اُسی ایک ذات سے لگی رہے ؎

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خُدا میرے لئے ہے

اتباعِ سُنّت پر صوفیائے کرام نے اتنا زور دیا ہے۔ کہ ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کہ اگر شریعت کے چراغ روشن ہیں۔ تو صرف انہی کے دَم سے ہیں۔ دیکھئے اپنے اپنے مخصُوص انداز میں یہ مشائخ کرام شریعت کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔

شریعت، اولیاء اللہ کی نظر میں

رئیس الطائفہ جنید بغدادیؒ | ایں کسے باشد کہ کتاب بدستِ راست گرفتہ باشد و سُنّت مصطفےٰ بردستِ چپ و در روشنائی ایں دو شمع می رود تا نہ در مغاکِ شبہت اُفتد نہ در ظلمتِ بدعت۔ (تذکرۃ الاولیاء، صـ)

ترجمہ:۔ سلُوک کی راہ وہ شخص طے کرسکتا ہے۔ جس کے دائیں ہاتھ میں قرآن ہو، اور بائیں ہاتھ میں رسولؐ کریم کی سُنّت۔ تاکہ ان دونوں شمعوں کی روشنی میں چلنے سے نہ تو وہ شکوک و شبہات کے گڑھے میں گرے۔ اور نہ بدعت کی اندھیریوں میں ٹامک ٹوئیاں مارے۔

شیخ ابوبکر طمستانی رح

الطریق واضح والکتاب والسنۃ قائم بین اظہرنا۔ (رسالہ قشیریہ ص۳۴)

ترجمہ:- راستہ کھلا ہوا ہے۔ اور کتاب وسنت ہمارے سامنے موجود ہے۔

شیخ یحییٰ بن معاذ رازی رح

اجتنب صحبۃ ثلاثۃ اصناف من الناس العلماء الغافلین والفقراء المداھنین والمتصوفۃ الجاھلین (کشف المحجوب ص۱۳)

ترجمہ:- غافل علماء، منہ پھٹ فقرا اور جاہل صوفیا کی ہم نشینی سے گریز کر۔ یہ تین گروہ صحبت کے قابل نہیں۔

علامہ ابن جوزی رح

وماکانت المتقدمون فی التصوف الارؤسا فی القرآن والفقہ والحدیث والتفسیر (تلبیس ابلیس ص۳۴۵)

ترجمہ:- ماضی میں صوفیائے کرام قرآن، فقہ، حدیث اور تفسیر کے زبردست عالم ہوتے تھے۔

شیخ علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش رح

ہر کرا علم شریعت نیست دلش بہ نادانی بیمار است (کشف المحجوب ص۱۲)

ترجمہ:- جسے شریعت کا علم نہیں ہے۔ اُس کا دل جہالت کے مرض میں مبتلا ہے۔

خواجہ فریدالدین عطار رح

جاوید در متابعت مصطفٰے گزیں
تا نورِ شرع او شود بر تو مقتدا

ترجمہ:- ہمیشہ حضرت مصطفٰے کی پیروی کر، تاکہ اُن کی شریعت کا نور تیری راہنمائی کرے۔

شیخ مصلح الدین سعدی شیرازیؒ | خلاف پیمبر کسے راہ گزید — کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید۔

ترجمہ:۔ جس نے بھی پیغمبر علیہ السلام کے خلاف راہ اختیار کی۔ وہ ہرگز منزلِ مقصود تک نہ پہنچے گا۔

شیخ بابا فرید شکر گنجؒ | جاہل پیر مسخرِ شیطان ہوجاتا ہے۔ اُس کی نگاہ حقیقت اور سراب میں امتیاز کرنے سے قاصر رہتی ہے۔

شیخ نظام الدین اولیاؒ | پیر آں چناں باید کہ در احکام شریعت و طریقت عالم باشد و چوں ایں چنیں باشد او خود ہیچ نامشروع نفرماید (فوائد الفواد ص۱۴۷)

ترجمہ:۔ پیر اس شان کا ہونا چاہیئے، کہ وہ شریعت، طریقت اور حقیقت کا عالم ہو۔ جب اُس کے اندر یہ خصوصیت ہوگی۔ تو خلافِ شرع کوئی فعل اُس سے سرزد نہ ہوگا۔

شاہ کلیم اللہ دہلویؒ | اے برادر، در تفاوتِ مراتب فقرا اگر امروز خواہی کہ دریابی بجانب شریعت معیار است۔ عیارِ فقیر بہ شریعت روشن می گردد۔ (مکتوبات کلیمی ص۲۲ مکتوب ۱۰۰)

ترجمہ:۔ اے بھائی اگر تو آج فقراء کے درجات و مراتب کا فرق جاننا چاہتا ہے۔ تو یہ دیکھ کہ وہ کہاں تک شریعت کے پیرو ہیں۔ شریعت ہی ایک ایسی کسوٹی ہے۔ جس پر کسی فقیر کی حقیقت پرکھی جاتی ہے۔

شیخ حسین نوریؒ | من لا ینبئہ یدعی مع اللہ عزو جل حالۃ تخرجہ عن حد علم

الشرع فلا تقربنه ومن رأيته يدعي حالة لا يدل عليها
لا يشهد لها حفظ ظاهر فاتهموه على دينه (تلبیس ابلیس ص۳۷۲)

ترجمہ:۔ اگر کسی شخص کو دیکھو، کہ خداوند تعالےٰ کے ساتھ ایسی حالت کا دعویٰ کرتا ہے، جو اس کو علم شریعت کی حد سے نکال دیتی ہے۔ تو اُس کے قریب نہ جاؤ۔ اور اگر کسی شخص کو دیکھو۔ کہ وہ ایک حالت کا دعویٰ کرتا ہے۔ جس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور ظاہری احکام کی پابندی اس کی شہادت نہیں دیتی۔ تو اُس کے دین پر تہمت لگاؤ۔

شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ | مشرب پیر حجت نمی شود دلیل از کتاب و حدیث می باید۔ (اخبار الاخیار ص۸۱)

ترجمہ:۔ کسی پیر کا مسلک دلیل نہیں بن سکتا۔ کتاب و سُنّت کی حجت کے بغیر چارہ نہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ | ایک پیر و مرشد کے لئے یہ لازمی ہے، کہ وہ قرآن و حدیث کا زبردست عالم ہو۔ (قول الجمیل ص۱۴)

میر خوردؒ | وكانوا لدين الله حصناً حصيناً ولسنة من تمسّك خير الرسل (سیر الاولیا) (سیر الاولیا) ترجمہ:۔ وہ خدا کے دین اور پیغمبرؐ کی سُنّت کے لئے مضبوط قلعے تھے۔

تصوف اسلام میں مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں۔ کہ اسلامی تصوف وہ تھا۔ جو خود حضرت سرور کائنات علیہ السلام کا تھا۔ جو ابوبکر صدیقؓ اور علی مرتضیٰؓ کا تھا۔ جو سلمانؓ و ابوذرؓ کا تھا۔ جس کی تعلیم جنیدؒ بغدادی اور رابعہ بصریؒ نے دی ہے

جس کی ہدایت شیخ جیلانی، شیخ سہروردی، خواجہ اجمیری، مجدد الفی، خواجہ نقشبندی اور مجدد سرہندی کرتے رہے ہیں۔ اور جس کی دعوت اس دور آخر میں شاہ ولی اللہ دہلوی کی زبان قلم دیتی رہی۔

حالات کے تقاضے اور وقت کی مصلحتیں علمائے ظاہر ہی کو اس بات پہ مجبور کرتی رہی ہیں، کہ وہ خلوت میں احکام شریعت کا اعلان کریں۔ اور جلوت میں اُمرا و سلاطین کی خوشنودئ مزاج کی خاطر زبان بند رکھیں یا من گھڑت تاویلات کا سہارا ڈھونڈیں۔ اس کے برخلاف ہم یہ دیکھتے ہیں، اور تاریخ اِس پر گواہ ہے کہ صوفیہ یا عُلمائے حق نے (علمائے حق بھی دراصل صوفیہ کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں) کبھی لاگ لپیٹ سے کام نہیں لیا۔ کبھی اَیسا نہیں ہوا، کہ اُنہوں نے اعلانِ حق سے پہلو تہی کی ہو۔ ذیل کی چند مثالیں ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔

(۱) عمرو بن ہبیرہ جب خلیفہ دمشق یزید ابن عبدالملک کی جانب سے والئ عراق و خراسان مقرر ہو کر آیا۔ تو اُس نے خواجہ حسن بصری، امام ابن سیرین اور امام شعبی کو طلب کیا۔ اور اُن کے سامنے یہ تقریر کی۔ کہ یزید بن عبدالملک کو خدا وند تعالیٰ نے اپنے بندوں پر خلیفہ مقرر کیا ہے۔ اور اُس سے اپنی اطاعت کا عہد لیا ہے اور ہم سے (یعنی ملازموں سے) اُس کا حکم سُننے اور بجا لانے کا۔ مُجھ کو جو عہدہ خلافت کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ وہ آپ سب کو معلوم ہے خلیفہ کی جانب سے ایک حکم مجھ کو ملتا ہے۔ اور مَیں اُس کی بلا تامل تعمیل کرتا ہوں۔ اِس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ خواجہ حسن بصری اس سیاسی گفتگو کا جواب جن صاف اور

سچے الفاظ میں دیا، وہ قابل شنید ہیں۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ اے ابن ہبیرہ! یزید کے معاملے میں خداوند تعالے سے ڈر، اور خداوند تعالے کے معاملہ میں یزید کا خوف مت کر۔ خدا تعالے تجھ سے یزید کے شر کو دفع کر سکتا ہے۔ مگر یزید اُس احکم الحاکمین کے قہر کو نہیں روک سکتا۔ وہ وقت بہت دور نہیں، کہ خداوند عالم تیرے پاس اپنا ایک فرشتہ بھیجے گا، جو تجھ کو شاندار تخت اور وسیع محل سے علیحدہ کرکے تنگ قبر میں پہنچا دے گا۔ وہاں سوائے تیرے اعمال کے کوئی تجھ کو نجات نہیں دلوائے گا۔ اے ابن ہبیرہ! اگر تو خدا کا گناہ کرے، تو خوب سمجھ لے، کہ خلیفہ کو اُس نے اپنے دین کا اور اپنے بندوں کا محافظ اور ناصر مقرر کیا ہے۔ پس خدا کے دین کے خلاف اُس کے مقرر کئے ہوئے حاکم کی وجہ سے جسارت مت کر۔ کیونکہ خالق اکبر کے مقابلے میں مخلوق کا حکم ماننا کسی طرح روا نہیں۔ (ابن خلکان جلد ۲ صفحہ ۱۲۸)

(۲) جب منصور عباسی بغداد کا خلیفہ ہوا۔ تو اُس کی نظر منصب امامت کے لئے امام اعظم پر پڑی۔ چنانچہ انہیں کوفہ سے بلایا۔ اور عہدۂ قضا قبول کرنے کی فرمائش کی۔ امام اعظم نے یہ عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ منصور نے قسم کھا کر کہا۔ کہ تم کو قاضی ضرور مقرر کروں گا۔ امام اعظم نے بھی قسم کھا کر کہا۔ کہ میں اس عہدہ کو منظور نہیں کروں گا۔ خلیفہ نے دوبارہ قسم کھائی۔ انہوں نے مکرر قسمیہ انکار کیا۔ اور اپنے انکار کی وجہ یہ بیان کی۔ کہ میں اپنے آپ کو اس منصب کا اہل نہیں سمجھتا۔ حاجب ابن ربیعہ نے خلیفہ کی چاپلوسی میں امام اعظم سے کہا، کہ امیر المومنین قسم کھا چکے ہیں۔ امام اعظم نے فرمایا، کہ امیر المومنین کے لئے کفارۂ قسم ادا کر دینا بہ نسبت میرے زیادہ سہل ہے

مختصر یہ ہے کہ خلیفہ نے امام اعظم کو قید میں ڈال دیا۔ اس قید و بند کے عالم میں امامؒ انتقال کیا۔ (ابن خلکان ج ۲ ص ۱۲۵)

(۳) ابو جعفر منصور خلیفہ بغداد نے ایک بار امام عبداللہ بن طاؤس کو اپنے پاس بلایا، اور ملاقات کے دوران میں ابن طاؤس سے کہا کہ اپنے والد سے کوئی حدیث روایت کرو۔ اس فرمائش سے ابن طاؤس کو گویا موقع مل گیا۔ کہ وہ خلیفہ کو اس کی بے اعتدالیوں اور سختی پر متنبہ کریں۔ چنانچہ انہوں نے موقعہ اور محل کے اعتبار سے یہ حدیث سنائی۔ ان اشد الناس عذاباً یوم القیامۃ رجلٌ اشرکہ اللہ تعالیٰ فی سلطانہ فادخل علیہ الجور فی حکمہ۔ یعنی میرے والد نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی ہے کہ قیامت کے دن سب سے بڑھ کر عذاب اُس کو ہوگا۔ جس کو خدا تعالیٰ نے اپنی حکومت میں شریک کیا ہو اور پھر وہ ظالمانہ حکومت کرے۔ منصور نے تمام فرمان رسول کے سامنے سنا اور چپ رہا۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مجھ کو ابن طاؤس کے قتل کا پورا یقین ہو گیا۔ اور میں نے اپنے دامن سمیٹ لئے کہ مبادا ان کے خون کی چھینٹیں میرے کپڑوں پر پڑیں۔ خلیفہ دیر تک خاموش رہا۔ پھر نگاہ اٹھائی اور ایک سوال کیا۔ ابن طاؤس کے قلب پر اب بھی خلیفہ کا رعب غالب نہ ہوا تھا۔ اس سوال کا جواب بھی پوری آزادی سے دیا۔ خلیفہ نے تنگ آ کر کہا۔ تو ما تم؟ میرے پاس سے دونوں اٹھ جاؤ۔ ابن طاؤس نے فرمایا۔

یہ تو ہماری عین مراد ہے۔ اور یہ کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اُس روز سے میں ابن طاؤس کے فضل و کمال کا اور بھی زیادہ قائل ہو گیا۔

(ابن خلکان ج ۱ ص ۲۴۳)

(۴) خلیفہ منصور عباسی کے چہرہ پر ایک مکھی بار بار بیٹھی۔ تو اُس کا ناک میں دم آگیا۔ اُس نے جھلا کر مشہور مفسرِ قرآن عالم ربانی شیخ ابن سلیمان سے کہا۔ کہ آخر مکھی پیدا کرنے کی خدا کو کیا ضرورت پیش آئی تھی۔ اس عالم ربانی نے جواب دیا۔ کہ تجھے خبر نہیں، خدا نے مکھیاں اس لئے پیدا کی ہیں۔ کہ متکبر کا غرور ٹوٹے، اور اُس کا سر نیچا ہو۔ (ابن خلکان ج ۲ صـ ۱۱۳)

(۵) حضرت سفیان ثوریؒ ایک وفعہ خلیفہ مہدی عباسی کے پاس گئے اور اس سے کہا۔ کہ مجھے یہ روایت پہنچی ہے۔ کہ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ نے اپنے ایک سفرِ حج میں صرف بارہ اشرفیاں صرف کی تھیں۔ تمہارا اسراف جس حد کو پہنچا ہے اس کے بیان کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ خلیفہ نے غضبناک ہو کر کہا۔ کیا آپ کو ... میری بھی کرنا چاہتے ہو۔ حضرت سفیان ثوریؒ نے جواب دیا۔ کہ مجھ سے ... ہو۔ مگر جس حال میں ہو۔ اُس میں تو کمی کردو۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ صـ ۱۸۵)

(۶) ایک دفعہ ہارون الرشید اور شاہزادے امام مالک کے یہاں آئے ... امام سے حدیث سنانے کی فرمائش کی۔ امام ممدوحؒ نے فرمایا۔ کہ میں نے عرصہ سے ... عام چھوڑ دیا ہے۔ اب صورت یہ ہے، کہ دوسرے مجھے حدیث سناتے ہیں۔ ... میں سنتا ہوں۔ ہارون الرشید نے کہا۔ پھر بہتر یہ ہے کہ میں حدیث سناؤں گا ... کی صورت یہ ہوگی۔ کہ آپ عام آدمیوں کو اپنی مجلس سے رخصت کر دیجئے ... مالک نے جواب میں ارشاد فرمایا۔ کہ اگر خواص کی خاطر عوام محروم کر دیئے جائیں تو ... خواص کو بھی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ یہ فرما کر امام ممدوحؒ نے اپنے ایک شاگرد ابن ... کو حکم دیا۔ کہ وہ سبق شروع کریں۔ چنانچہ ابن عیسیٰ نے فوراً سبق شروع کر دیا۔

اور خلیفہ کو خاموش رہنا پڑا۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ صـ۱۹۱)

(۷) جب سلیمانؔ بن عبدالملک خلیفہ دمشق شدتِ مرض میں اپنی زندگی سے مایوس ہوگیا۔ تو اُسے اپنے جانشین کے تقرّر کی فکر دامنگیر ہوئی۔ اُس نے ایک کاغذ پر ولی عہد کا نام لکھّا۔ اور مشورہ کے لئے مشہور تابعی امام حدیث امام رجا بن حیات کے سامنے پیش کیا۔ امام ممدُوح نے اس کاغذ پر خلیفہ کے ایک نابالغ بیٹے کا نام درج پایا۔ یہ دیکھ کر انھوں نے سلیمانؔ سے فرمایا، کہ خلیفہ کو اگر قبر میں آسودگی مطلوب ہے، تو اپنا جانشین کسی لائق اور اہل شخص کو مقرّر کرنا چاہیئے۔ خلیفہ کے دِل میں یہ بات تیر کی طرح چُبھی۔ اور غور و فکر کے لئے امام ممدُوح سے ایک یا دو دِن کی مہلت طلب کی۔ ایّامِ مہلت میں خلیفہ نے کاغذ چاک کر ڈالا۔ اور پھر امام ممدُوح کو بُلا کر پُوچھا۔ کہ میرے بیٹے داؔؤد کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے امام نے فرمایا، کہ وہ قسطنطنیہ کی مہم پر یہاں سے سینکڑوں میل دُور ہے۔ اور نہ معلوم زندہ بھی ہے یا نہیں۔

خلیفہ:۔ تو پھر مَیں کس کو ولی عہد مقرّر کروں ؟۔

امام:۔ جو امیرالمومنین کی رائے میں اس منصب کے قابل ہو۔

خلیفہ:۔ عمرؔ بن عبدالعزیز کی نسبت آپ کا کیا خیال ہے ؟

امام:۔ میرے خیال میں وہ نیک فاضل اور سلیم الطبع ہیں۔

خلیفہ:۔ تمہاری رائے دُرست ہے۔ وہ ایسے ہی ہیں۔ اور مَیں انہیں کو اپنا ولی عہد مقرّر کروں گا۔"

غرض خلیفہ نے ولی عہدی کی سند حضرت عمرؔ بن عبدالعزیز کو لکھّی۔ اور اُسے

سربمہر کر دیا۔ اس کے بعد کوتوال شہر کو طلب کر کے حکم دیا۔ کہ خاندان خلافت کے کل ارکان حاضر کئے جائیں۔ جب سب حاضر ہوئے، اور امام رجاءؒ نے خلیفہ کی خواہش کے مطابق اس سربمہر کاغذ پر سب سے بیعت لے لی۔ اور ان سب کو رخصت کر دیا تو موت نے خلیفہ سلیمان کو تھوڑی دیر بعد ہی اپنی آغوش میں لے لیا۔ امام ابن حیات نے ایوانِ خلافت کے دروازے پر کسی معتمد کو متعین کر دیا۔ اور یہ ہدایت دے دی، کہ کسی کو اندر نہ جانے دیا جائے۔ مقصد یہ تھا، کہ خلیفہ کی وفات کی خبر عوام میں نہ پھیلے۔ اس انتظام سے فارغ ہو کر امام نے کوتوال کے ذریعہ پھر اہل بیت خلافت کو طلب کیا۔ اور دوبارہ اس سربمہر فرمان پر بیعت لی۔ جب بیعت ہو چکی۔ اور انہوں نے یہ سمجھ لیا، کہ اب کارروائی پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی ہے۔ تو امام نے اعلان کیا۔ کہ خلیفہ کی وفات ہو گئی ہے۔ اور یہ کہہ کر کاغذ کی تحریر سنائی۔ جب ہشام بن عبد الملک نے جو دعویدار خلافت تھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کا نام سنا۔ تو کہنے لگا۔ کہ قسم ہے رب کی، ہم کبھی ان کے ہاتھ پر بیعت نہیں کر سکتے۔ امام رجاء ابن حیات نے کہا، کہ بہتر ہے کھڑے ہو اور آ کر بیعت کرو۔ ورنہ تلوار تمہارا کام تمام کر دے گی۔ ہشام کو موقعہ کا رنگ دیکھ کر چارو ناچار بیعت کرنی پڑی۔ ہشام کی بیعت کے بعد امام رجاءؒ نے حضرت عمر بن عبد العزیز کا بازو پکڑا۔ اور منبر پر بٹھا دیا۔ منبر پر پہنچتے ہی ان کی خلافت کا عملی دور شروع ہو گیا۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص۱۰۵)

(۸) امیر تیمور نے ایک روز اپنا ایک قاصد کسی ضروری کام پر روانہ کیا۔ اور اُسے یہ اجازت دے دی۔ کہ ضرورت کے وقت جس کا بھی گھوڑا مل جائے۔ اُس پر سوار ہو لے۔ قاصد کو چلتے چلتے ایک جگہ سواری کی حاجت ہوئی۔ اتفاقاً اس موقعہ پر

علامہ تفتازانی خیمہ زن تھے۔ اور خیمے کی پیش گاہ میں اُن کے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ قاصد وہاں گیا۔ اور اُس نے وہاں جاتے ہی بے دھڑک ایک گھوڑا کھول لیا علامہ ممدوح اس وقت اپنے خیمے کے اندر تھے۔ اِس قصّے کی اطلاع ہوئی۔ تو سخت برہم ہوئے۔ اور قاصد سُلطانی کو پٹوا کر نکلوا دیا۔ جب وہ لوٹ کر دربار میں پہنچا۔ تو علامہ کی شکایت کی۔ امیر تیمور پر جو حالت گُذری ہوگی۔ آسانی سے اُس کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ سخت غضب ناک ہوا۔ اور تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد کہا، تو یہ کہا کہ اگر شاہرخ بھی یہ حرکت کرتا۔ تو بیشک سزا پاتا۔ مگر میں ایسے شخص کا کچھ نہیں کر سکتا۔ جس کا قلم ہر شہر اور ہر مُلک کو میری تلوار سے پہلے فتح کر چکا ہے۔

(شقائق النعمانیہ ج ۱ ص ۹۵)

(۹) سلاطینِ اسلامیہ میں سُلطان سلیم خاں بڑے جلال اور بڑی ہیبت کا بادشاہ ہوا ہے۔ ایک دفعہ اس کو اپنے خزانہ کے ملازمین پر غصّہ آ گیا۔ اور اُس نے ڈیڑھ سو آدمیوں کے قتل کا حکم صادر کر دیا۔ مولانا علاؤالدین جمالی ان دنوں قسطنطنیہ میں مفتی تھے۔ اُنھوں نے جو یہ سخت حکم سُنا، تو انہیں ان بیکس ملازموں پر رحم آیا۔ اور سُلطان کو سمجھانے کے لئے باب عالی کا رُخ کیا۔ جب مولانا دیوان وزراء میں داخل ہوئے۔ تو سارے اہل دیوان حیران رہ گئے، کہ خُدا خیر کرے، مولانا کیسے تشریف لائے۔ حضور سُلطانی میں ان کی اطلاع ہوئی۔ اجازت ملی، کہ تنہا آئیں مولانا وہاں پہنچے، اور سلام کر کے بیٹھ گئے۔ بیٹھنے کے بعد سلسلۂ تقریر یوں شروع کیا۔ جو علماء فتوی کا منصب رکھتے ہیں۔ اُن کا فرض ہے۔ کہ وہ سلطانِ وقت کی آخرت کا بھلا بھی چاہیں۔ میں نے سُنا ہے، کہ سُلطان نے ڈیڑھ سو آدمیوں کے

قتل کا حکم صادر کر دیا ہے۔ حالانکہ شرعاً یہ تجویز ناجائز ہے۔ لہٰذا میں عفو و درگذر کی استدعا کرتا ہوں۔ سلطان پر اپنے مفتی کی یہ مداخلت سخت شاق گذری۔ اُس نے قہرآلود ہو کر کہا۔ تم کو اپنے اختیارات کی حدود کے دائرے سے باہر قدم نہیں رکھنا چاہیئے۔ سلطنت کے معاملات میں دخل دینے کے کیا معنی! ۔ مولانا نے جواب دیا۔ کہ میں سلطنت کے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ بلکہ سلطان کی عاقبت کی عافیت چاہتا ہوں۔ اور میرا یہ فرض ہے ان عفوت فلک النجاة والا فلک عقابٌ عظیم۔ اگر اسے سلطان تو عفو و درگذر سے کام لے گا۔ تو تیرے لئے نجات ہے، ورنہ تو سخت عذاب میں مبتلا ہوگا۔ سلطان کے دل پر اس کلام کی ہیبت اثر کر گئی۔ اور غصہ فرد ہو گیا۔ اور ان تمام ملازمین کی خطائیں معاف کر دیں۔ جب مولانا نے اُٹھنے کا قصد کیا، تو فرمایا۔ کہ میں سلطان کی آخرت کے بارے میں تو اپنا فرض منصبی ادا کر چکا۔ اب ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں، جو سلطان کی شان کے شایاں ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ سب بیچارے آپ کے غلام ہیں۔ کیا یہ مناسب ہوگا۔ کہ شاہی غلام ہو کر دربدر بھیک مانگتے پھریں۔ سلطان نے کہا، نہیں یہ مناسب نہیں۔ مولانا نے فرمایا۔ تو پھر اُن کو اُن کی ملازمتوں پر بھی بحال کر دیا جائے۔ سلطان نے مولانا کی یہ بات بھی مان لی۔ لیکن یہ کہا۔ کہ میں ان کو قصور کی سزا ضرور دوں گا۔ مولانا نے فرمایا۔ اس میں مجھے کوئی دخل اور کلام نہیں ہے۔ کیونکہ یہ معاملہ سلطان اور اُس کی سیاست سے سروکار رکھتا ہے۔ یہ کہا اور سلام کے بعد مولانا علاؤالدین جمالی اپنے گھر تشریف لے آئے۔ (شقائق نعمانیہ ج ا ص۳۲۴)

(۱۰) امام نسائی (جن کی سُنن صحاح ستہ میں شامل ہے) جب دمشق تشریف

رہے گئے، تو ایک روز مسجد میں ایک شامی نے اُن سے پُوچھا۔ کہ حضرت معاویہؓ کے فضائل کیا کیا ہیں۔ امام ممدوحؒ نے فرمایا، کہ تو اِس بات کو کافی نہیں سمجھتا، کہ وہ اپنا دامن بچا کر نکل گئے۔ تو اُن کے مناقب پوچھتا ہے۔ یہ فقرہ سُن کر دمشقی بھڑک اُٹھے۔ اور امام نسائیؒ کے ایک نازک مقام پر اتنی ضربیں رسید کیں کہ وہ بیہوش ہو گئے بیہوشی کی حالت میں اُن کے رفقا انہیں مسجد سے باہر لائے۔ اور اسی دردناک صدمے سے اس امامِ حدیث نے وفات پائی۔ (تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص۲۶۹)

یہاں تک تو علمائے ربانی کی حق گوئی کے تذکرے تھے۔ اب یہ دکھانا مقصود ہے، کہ اُمرا اور سلاطین پر اُن کی نشستوں کے کیا اثرات تھے۔ تاریخ بتلاتی ہے، کہ قریباً ہر دَور میں اُمراء و سلاطین نے فقراء کی دہلیز پر ماتھے رگڑے ہیں۔ دراصل یہ مردانِ حق کی خداشناسی کا جوہر تھا۔ جس نے شاہانِ کبار اور اُمرائے ذی اقتدار کی گردنیں جھکا دیں۔

آئینِ جوانمرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

حضرت ابراہیم بن ادہم بلخیؒ، حضرت خواجہ ابو احمد ابدال چشتیؒ، شاہ شجاع کرمانیؒ خواجہ احمد بن حماد، احمد بن محمد البدیا باکی، شاہ علی فراہیؒ وغیرہ بادشاہ تھے لیکن مردانِ حق آگاہ کے تصرفات کے تیر اُن کے سینوں میں کچھ اس طرح پیوست ہوئے، کہ اُنہوں نے بادشاہی پر لات مار دی۔ اور خرقۂ درویشی پہنا۔

مقامِ فقر ہے کتنا بلند شاہی سے
ترا مزاج گدایانہ ہو تو کیا کہیے

تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے، کہ ارباب حکومت نے آڑے وقت میں فقرائے روحانی مدد لی ہے۔ سلطان محمود غزنوی نے جب ہندوستان پر آخری بار چڑھائی کی۔ تو اس سے پہلے حضرت خواجہ ابوالحسن خرقانیؒ کے دربار میں حاضری دی تھی۔ انہیں کے خرقہ کا فیض تھا، کہ سلطان کو قدرت نے فتحمندی کی سعادت عطا کی۔ ۵۶۱ھ میں جب حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ نے اجمیر میں قدم رکھا۔ تو اس زمانہ میں اجمیر اور دہلی کا حکمران چوہان خاندان کا مشہور راجپوت راجہ پتھورا تھا۔ اس کے حکام نے خواجہ غریب نواز کے قیام میں بڑی مزاحمت کی۔ اور جب وہ خود ان کے مقابلہ میں بے بس رہے۔ تو ہندو جوگیوں کو اپنے جادو سے حضرت خواجہ کو شکست دینے کے لئے مامور کیا۔ ایک مشہور جوگی جے پال سے حضرت خواجہ کے بڑے بڑے معرکے ہوئے۔ لیکن حضرت خواجہ اپنی روحانی قوت اور باطنی کمال سے اس پر غالب رہے۔ جوگی نے انجام کار ہار مانی۔ اور حضرت خواجہ کے دست مبارک پر اسلام قبول کر لیا۔ حضرت خواجہ نے جے پال جوگی کا اسلامی نام عبداللہ رکھا۔ اور خلافت بھی مرحمت فرمائی۔ (خزینۃ الاصفیا ج ۱ ص ۲۶۵) حضرت خواجہ کا تبلیغ اور رشد و ہدایت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ان کی تعلیم سے راجہ پتھورا کے ملازم بھی مشرف با اسلام ہونے لگے۔ راجہ نے حضرت خواجہ کو اجمیر سے نکال دینے کی دھمکی دی۔ حضرت خواجہ نے دھمکی پر صرف یہ ارشاد فرمایا:-

"پتھورا را زندہ بہ مسلمانان دادیم" (فوائد السالکین ص۱۵)

چنانچہ یہ پیش گوئی صحیح نکلی سلطان شہاب الدین نے پتھورا کے خلاف ۵۸۸ھ

اور ۵۸۸ھ میں دو حملے کئے۔ اور آخری حملہ میں پتھورا گرفتار ہو کر مارا گیا۔ تذکرہ نگاروں کا بیان ہے، کہ شہاب الدین غوری خراسان میں تھا۔ کہ اُس نے ایک رات خواب میں دیکھا۔ کہ حضرت خواجہ رونق افروز ہیں۔ اور فرما رہے ہیں۔ کہ خداوند تعالےٰ تم کو ہندوستان کی بادشاہت عنایت کرنے والا ہے۔ تم اس ملک کی طرف توجہ کرو۔ اسی خواب کے بعد اس نے ہندوستان پر فوج کشی کی۔ (سیر الاقطاب صفحہ ۱۳۲)

شہاب الدین غوری کی فتح کے بعد مسلمانوں کے سیاسی اقتدار اور حضرت خواجہ کے فیوض و برکات سے ہندوستان، اسلام کے نور سے منور ہو گیا۔ اس لئے حضرت خواجہ کا لقب "وارث النبی فی الہند" ہے۔ سیر الاولیا میں ہے، کہ "بوصول قدم مبارک آں آفتاب اہل یقیں کہ بہ حقیقت معین الدین بود ظلمت ایں دیار بنور اسلام روشن و منور گشت۔" (سیر الاولیا ص ۴۷) اس اہل یقیں کے آفتاب کے قدموں کی برکت سے جن کی ہستی حقیقت میں دین کی معین (مددگار) تھی۔ اس ملک کی تاریکی کے بادل چھٹ گئے، اور در و دیوار روشن ہو گئے۔

دہلی میں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے قیام سے شاہی دربار پر غیر معمولی اثر پڑا۔ شمس الدین التمش اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ تو وہ اُس کو رعایا، فقیروں، غریبوں اور درویشوں کے ساتھ دوستی کی تلقین فرماتے۔ اور التمش اس پر عمل کرتا۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ خود فوائد السالکین میں فرماتے ہیں۔ اس کا یعنی التمش کا عقیدہ صحیح تھا۔ وہ راتوں کو جاگتا۔ کسی نے اُس کو سوتے نہیں دیکھا۔ وہ بیدار رہ کر عالم تحیر میں کھڑا رہتا۔ اور اگر سو جاتا۔ تو فوراً بیدار ہو جاتا، اُٹھ کر وضو کرتا۔ اور مصلّی پر جا بیٹھتا۔ اپنے نوکروں میں سے کسی کو نہ اُٹھاتا، اور کہتا کہ آرام سے سونے والوں کو

تکلیف کیوں دی جائے۔ رات کو وہ گدڑی پہنتا، تاکہ اس کی خبر کسی کو نہ ہو۔

صوفیائے کرام کے اصولِ زندگی

یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ کہ صوفیائے کرام کی زندگی کا انداز صحابہ کرامؓ اور اصحابِ صفہؓ سے ملتا جلتا تھا۔ صوفیائے کرام کا یہ مقدس گروہ آنحضرت صلعم کی غارِ حرا، شعب ابی طالب اور غارِ ثور کی روحانی زندگی کی پیروی میں ریاضت و مجاہدہ کرتا تھا۔ صحابہ کرامؓ کی خداخوفی اور حق پرستی ان صوفیائے کرام میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کے صدق، حضرت عمرؓ کے عدل، حضرت عثمان غنیؓ کی حیا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زہد و اتقا کی زندہ مثالیں اگر کہیں نظر آسکتی ہیں۔ تو صرف صوفیائے کرام کی زندگیوں میں نظر آسکتی ہیں۔ محدثین اور فقہا نے تو آنحضرت صلعم اور آپ کے صحابہؓ کے اقوال و افعال کی جمع و ترتیب اور ان کی نشر و اشاعت کا فریضہ سرانجام دیا۔ صوفیائے احوال کی جانب توجہ کی۔ پہلے انہیں خود اپنے اوپر وارد کیا۔ بعد ازاں دوسروں تک اُن کے باطنی اثرات منتقل کئے۔ یہ انہیں صوفیائے کرام کا فیض ہے کہ آج دنیا میں صلاح و تقویٰ، زہد و ورع، صبر و قناعت، تسلیم و رضا، اور صدق و صفا وغیرہ کی روایات ہمارے دل و دماغ میں روحانیت کا صور پھونک رہی ہیں۔ جہاں سلاطین کی شمشیریں اور علماء کی زبانیں تبلیغ اسلام کا فریضہ سرانجام دینے سے قاصر رہیں۔ وہاں ان صوفیائے کرام کی نگاہوں نے وہ کام کیا۔ کہ کوہ قاف سے راس کماری تک، مکہ مکرمہ سے ماسکو تک، بربر و اندلس سے لاہور و دہلی تک اسلامی تعلیمات کے

برقی قمقمے روشن کردیئے ؎

دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

صوفیائے کرام کی سیرتیں ہمیں یہ بتلاتی ہیں۔ کہ اُن کے اصُولِ زندگی کچھ اِس قِسم کے تھے۔

(۱) اُن کی نظر میں وہ تمام معاشرتی اصُول ہیچ تھے۔ جو اُن کے نصب العین کی کسوٹی پر پوُرے نہ اُترتے تھے۔

(۲) یہ صوفیائے کرام ہر شے کا مالک حقیقی خدا کو مانتے تھے۔ مخلوق کی ملکیت کا تصوّر اُن کے ذہن پر بار گزرتا تھا۔ اس لئے وہ اپنے کسی مُرید کو طلبِ دُنیا کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ بلکہ وہ ایسا کرتے تھے۔ کہ مُرید کو رُوحانی ارتقا کے اِس مقام تک پہنچا دیتے تھے، کہ دُنیا خود اُس کی طالب ہو جاتی۔ شاہوں کے سر اُس کی دہلیز پر جھکتے ... لیکن اس مُرید کا سر خدا کے آستانے کے سوا اور کہیں نہ جُھکتا ؎

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

سُلطان نظام الدین اولیأ نے اپنے ایک مُرید سے صرف اِس بنا پر خلافت نامہ واپس لے لیا تھا۔ کہ اُس نے اپنے کنُبہ کی فاقہ زدگی کو دیکھ کر دو دو دو تنکہ علاؤالدین خلجی کے اُس فرمان پر غور کیا تھا۔ جس کی رُو سے اُسے اودھ کا قاضی قرار کر دیا گیا تھا۔ وجہ معاش کے لیئے دو صُورتیں اِختیار کرنے کی اجازت تھی۔

ایک تو ہمسایوں کی بے مانگی مدد جسے فتوحات کہا جاتا ہے۔ اور دوسرے زمین کی کاشت۔

(۳) صوفیائے کرام اپنے مریدوں کو صدقِ مقال اور اکلِ حلال کی تلقین کرتے تھے۔ ہر مرید کے لئے یہ ضروری تھا۔ کہ وہ اپنے لئے اسی قسم کا کسب کرے جیسے اصحابِ صفہ رضی اللہ عنہم عہدِ نبوت میں کیا کرتے تھے۔ سیر الاولیاء میں حضرت شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کی خانقاہ کا یہ نقشہ دکھایا گیا ہے۔ کہ مریدین دن بھر مشقت کرتے لکڑیاں اور کریلے تو جنگل سے لاتے تھے لیکن نمک دوسروں کی طرف سے قبول کر لیتے۔

(۴) تمام صوفیا عالم و فاضل ہوتے تھے۔ عوام سے اُن کا گہرا تعلق ہوتا تھا کس قدر افسوس کی بات ہے۔ کہ اس دور کے صوفی اور عالم عوام سے کم اور خواص سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ اُن میں نفسانیت آگئی ہے۔ کاش وہ اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پہ چلتے۔ اور عوام کے لئے اُن کی شخصیتیں نشانِ راہ ثابت ہوتیں۔

(۵) صوفیائے کرام کی خانقاہوں میں بحث و تکرار کی مطلقاً کوئی گنجائش نہ تھی۔ اُن کی دنیا رشد و ہدایت اور مہر و محبت کی دنیا تھی ؎

اُن کا جو کام ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
اپنا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

(۶) صوفیائے کرام کی زندگی کا اہم جزو سیاحت رہا ہے۔ تبلیغِ اسلام کی خاطر اُنہوں نے دُور دراز کے مقامات کی سیاحت کی ہے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ،

خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ، بابا فرید شکر گنجؒ اور دوسرے صوفیائے کرام کی زندگیاں اس کی روشن مثالیں ہیں۔ سکندر لودھی اور ہمایوں کے معاصر شیخ جمال الدینؒ دہلوی دہلی سے مصر گئے، ہرات گئے، اور مولانا جامی کے پاس قیام کیا، واپس دہلی آئے تو لوگوں نے کہا۔ کہ ہندوستان کے انتہائی جنوبی گوشے میں حضرت آدم صفی اللہ کے نقش قدم کا سراغ ملا ہے، چنانچہ آپ نے عصا سنبھالا اور پھر چل کھڑے ہوئے۔

(۵) صوفیائے کرام کی زندگی کا جوہر امن پسندی تھا سلطان نظام الدینؒ اولیاء کا ارشاد ہے۔ کہ درویشوں اور عام لوگوں کا راستہ ایک جیسا نہیں ہے درویش دوست اور دشمن دونوں کا دوست ہوتا ہے ؎

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا!

اس تمہید کے بعد چاہیئے تو یہ تھا۔ کہ ہم اس دلچسپ اور بصیرت افروز داستان کا آغاز حضرت سید مخدوم علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخشؒ کی سیرت مطہرہ سے کرتے۔ کیونکہ اس کتاب کا موضوع تنہا اُنہی کی شخصیت ہے۔ لیکن صرف اس خیال سے کہ ہمارے قارئین کا اُن دو مردانِ خدا سے بھی تعارف ہو جائے۔ جو حضرت داتاؒ سے قبل لاہور میں تبلیغی خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔ ہم حضرت شیخ اسمٰعیل بخاریؒ اور حضرت میر حسین زنجانیؒ کے بارے میں کچھ عرض کرتے ہیں۔ یہ دونوں بزرگ متقدمین میں سے ہیں انہی کے باطنی فیوض کا اثر تھا۔ کہ لاہور نے غزنین کے شیخ داتا شاہ ہجویریؒ کا خاطر خواہ خیر مقدم کیا۔ اور اُسے اُن کی ذات ستودہ صفات سے بہرہ اندوزی کے کافی و وافی مواقع میسر آئے۔ یہ بزرگ آج بھی زبانِ حال سے میر کی زبان میں ہمیں یہ

پیغام دے رہے ہیں ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

حضرت شیخ اسمٰعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ

لاہور کی سرزمین نے جس مقدس ہستی کے قدم آج سے ایک ہزار پچاس سال پہلے چومے۔ اُسی مقدس ہستی کو حضرت شیخ اسمٰعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نام نامی اور اسمِ سامی سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ کا نسبی و وطنی تعلق بخارا کے سادات عظام سے ہے۔ ۳۲۵ھ یا ۳۹۵ھ میں آپ لاہور تشریف لائے۔ "تحفۃ الواصلین" میں منقول ہے۔ کہ پہلے پہل لاہور میں جس مبلغ اسلام صوفی صافی نے اسلام کی تعلیمات کا پرچم بلند کیا۔ آپ ہی کی ذاتِ گرامی تھی۔ آپ بلند پایہ شیخ تھے۔ شریعت و طریقت کے علوم و معارف پر آپ کی گہری نظر تھی۔ مشہور فلسفی مستشرق ڈاکٹر آرنلڈ نے اپنی کتاب دعوت اسلام (Preaching of Islam کا اردو ترجمہ) میں لکھا ہے۔ کہ اس شیخ کی تبلیغ کا اندازِ عجیب تھا۔ کسی کے پیروں کی آہٹ سُنتے، تو بس آنکھ اُٹھا کر ایک نظر دیکھ لیتے۔ نظر اس قیامت کی ہوتی تھی۔ کہ اس کا وار کبھی خالی نہ جاتا تھا۔

کیا بچے ناوکِ نظر سے دل
چوکتی ہی نہیں شکار سے آنکھ

حضرت شیخ اسمٰعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس وعظ میں عوام کثرت سے شریک ہوتے تھے۔ روزانہ لوگ سینکڑوں کی تعداد میں اسلام قبول کرتے۔ جو شخص تھوڑی دیر کے لیئے بھی اُن کی مجلس میں حاضر ہوا، کلمہ پڑھے بغیر نہ رہ سکا۔ روایات میں آیا ہے، کہ جب شیخ اسمٰعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے لاہور میں قدم رنجہ فرمایا اور پہلے جمعہ آپ نے تبلیغی خطبہ ارشاد فرمایا۔ تو دو سو پچاس اشخاص نے آپ کے ہاتھ پر توبہ کی، اور مشرف بہ اسلام ہوئے۔ دوسرے جمعہ کو اس تعداد میں اور اضافہ ہوا۔ تقریباً پانچ سو پچاس اشخاص نے قبول اسلام کی سعادت حاصل کی۔ تیسرے جمعہ کو ایک ہزار اشخاص حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ تاریخ الاولیا اور "خزینۃ الاصفیا" کی روایات سے ثابت ہے۔ کہ آپ نے لاہور میں سب سے پہلے درس قرآن کے سلسلہ کی بنیاد ڈالی۔

کس قدر افسوس کا مقام ہے، کہ لاہور کے مسلمان جو آئے دن چند مخصوص مشاہیر کے یوم مناتے رہتے ہیں۔ اپنے اس قدیم ترین محسن کو بھولے ہوئے ہیں۔ عوام سے زیادہ ہمارے وہ علماء قصوروار ہیں، جو لاہور کی مختلف مساجد میں درس قرآن کے علمبردار ہیں۔ کیا سب سے پہلے مدرس قرآن کے اُن پر کچھ حقوق نہیں ہیں۔ ہیں اور ضرور ہیں، بلکہ قیامت تک رہیں گے۔ اُن کا یہ فرض ہے، کہ وہ اس قدیم محسن کی یاد تازہ کریں۔ اُن کا یوم منائیں، اور بڑی آن بان کے ساتھ منائیں۔ اس لیئے کہ درس قرآن جس کی لاہور میں اس شیخ نے داغ بیل ڈالی ہے۔ وہ نمایاں

کارنامہ ہے۔ جس کی بدولت دُنیا میں توحید و رسالت کی قندیلیں روشن ہیں۔ اور یہ ہی کارنامہ کا طفیل ہے۔ کہ ہم فخر و ناز کے ساتھ کہہ سکتے ہیں ؎

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا!

لاہور میں ایک دوسرے شیخ بھی اسی نام کے ہو گذرے ہیں۔ لیکن ان کا زمانہ بہت بعد کا ہے۔ یہ شیخ حافظ محمد اسمٰعیل میاں وڈا رحمۃ اللہ علیہ ہیں ۹۹۵ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ اور اُن کی وفات ۱۰۸۵ھ میں ہوئی۔ انشاء اللہ اُن کا حال بھی ہم قلمبند کریں گے۔[1] یہاں صرف نام کی مناسبت سے اُن کا ذکر آگیا ہے۔ اِس ذکر سے مقصود اس غلط فہمی کا ازالہ بھی ہے۔ جس میں لاہور اور دیگر مقامات کے عوام مبتلا ہیں۔ اور وہ یہ کہ مفسر و محدث شیخ محمد اسمٰعیل سے مراد یہاں میاں وڈا کی ذاتِ گرامی ہے۔ کیونکہ اُن کی درگاہ آج بھی عوام میں درس میاں وڈا کے نام سے مشہور ہے۔ اور اِس سلسلہ میں اُن کی کرامتیں بھی کافی شہرت پا چکی ہیں۔ یہ کتنی ناانصافی کی بات ہے۔ کہ حضرت شیخ اسمٰعیل بخاریؒ کو لوگ بھول ہی گئے۔ حالانکہ اُن کے درس کا سلسلہ حضرت میاں وڈاؒ کے سلسلۂ درس سے صدیوں پیشتر لاہور میں قائم و دائم رہا ہے ؎

اِس چمن میں ہیں رنگ رنگ کے پھول
کوئی لالہ ہے کوئی نرگس ہے

حضرت شیخ اسمٰعیل بخاریؒ کا وصال ۴۴۸ھ میں ہوا۔ اُن کا مزار عالیہ پٹیالہ ہاؤس کے متصل ایک اُونچے چبوترے پر واقع ہے۔ ۲۷ رجب آپ کے عُرس مبارک کی تاریخ ہے۔ "مہتاب" سے آپ کی تاریخِ وفات نکلتی ہے۔ مشہور یہ ہے۔ کہ یہاں

[1] زیرِ ترتیب کتاب "اولیائے لاہور" میں ان کا ذکر ہے۔

کوئی رات بسر نہیں کر سکتا۔ جب بھی کسی نے یہاں شب باشی کی جرأت کی۔ اُس پر اِس بلا کی دہشت سوار ہوئی، کہ بھاگتے ہی بنی۔ ؎

شیخ اسماعیلؒ وہ مہتاب ہیں
جن کی ضو سے رات صدیوں دن بنی
اے مقدّس خِطّہ لاہور سُن
شیخ کی ہستی تری محسن بنی!

حضرت میر حسین زنجانی رحمۃ اللہ علیہ

رئیس الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کے آفتاب ولایت کی شعاعیں بھی دُنیا کے گوشے گوشے میں آفتاب و مہتاب بن کر چمکیں۔ خُدا معلوم یہ کیسا آفتاب تھا۔ کہ جب سے اسے طلوع کی سعادت نصیب ہوئی۔ پوری آب و تاب کے ساتھ اپنی روپہلی کرنیں پھینک رہا ہے۔ اس جنیدی سُورج کی کرنیں وہ سلسلے ہیں۔ جنہیں حضرت جنید بغدادیؒ کے رُوحانی تصرفات نے نوازا ہے۔ یہ سلسلے ہیں گازرونیہ، طوسیہ، سہروردیہ، فردوسیہ زاہدیہ، اولیائیہ، انصاریہ، رفاعیہ، ابسویہ، عیدروسیہ، نوریہ، حلاجیہ، قشیریہ، رزاقیہ، وہابیہ، قلیسیہ، محمد شاہی، بہلول شاہی، ہاشم شاہی، سدو شاہی، مقیم شاہی، محمود شاہی قاسم شاہی، شطاریہ، سروری، جلالیہ، مخدومیہ بخاریہ، لعل شاہ بازیہ، صفویہ، موسے سہاگ شاہی، رسُول شاہی، دُولا شاہی، صوفیہ۔ ان کے علاوہ ان سلاسل کی لامتناہی شاخیں ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوا ہے، کہ کسی ایک سلسلہ کی ایک کڑی سے کئی کئی سلسلے نکلے۔

بادِ طوفاں کی قیامت خیزیاں :

قطرہ قطرہ موج، دریا موج موج

حضرت میر حسین زنجانیؒ کی عظیم الشان شخصیت اسی جنیدیؒ سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ موصوف ۳۹۵ھ میں یا اس کے لگ بھگ لاہور میں رونق افروز ہوئے۔ آپ کی وطنی نسبت خراساں کے قریبی قصبہ زنجان سے ہے۔ زنجان، اندجان اور سنجان خراسان کے گردونواح میں مشہور تاریخی قصبے ہیں۔ اندجان اور زنجان مردم خیز خطوں نے مشہور و معروف ہستیاں پیدا کی ہیں۔ شیخ فرخ زنجانی، سید یعقوب زنجانی ان خطوں میں برگزیدہ مشائخ گذرے ہیں۔ میر حسین زنجانیؒ اور سید یعقوب زنجانیؒ کے مزارات لاہور میں ہیں۔ ان کے علاوہ محمد شاہی دور میں میر عبدالعزیز زنجانیؒ لاہور کے مشہور عالم اور صاحب دیوان شاعر ہوئے ہیں "تذکرۃ الاخیار" میں اُن کا حال درج ہے

سب کہاں کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

حضرت میر حسین زنجانیؒ کی آمد لاہور کے بارے میں تذکرہ نویسوں نے جو سنین درج کئے ہیں۔ اُن میں اتنا اختلاف پایا جاتا ہے، کہ بعض مؤرخین کے نزدیک حضرت موصوف کی ہستی ایک سمجھنے کا نہ سمجھانے کا معمّہ بن کر رہ گئی ہے "ہسٹری آف لاہور" (انگریزی) کے مصنّف محمد لطیف نے تو ان کا ذکر تک بھی نہیں کیا۔ "تحقیقاتِ چشتی" کا مصنّف لکھتا ہے۔ "کہ آپ سیّد یعقوب زنجانیؒ صدر دیوان کے ہمراہ لاہور تشریف لائے۔" اور صدر دیوان کے متعلق ص ۲۳۷ پر یہ تحریر ہے۔ کہ وہ ۵۳۵ھ میں بہرام شاہ غزنوی کے دور میں تشریف لائے تھے۔ ص ۲۳۸ پر بائیس ۲۲ سال کا اضافہ کر کے ۵۵۷ھ کا سنہ تحریر

کیا ہے۔ صاحب "خزینۃ الاصفیا" مفتی غلام سرور لاہوری نے بھی حضرت میر حسینؒ اور حضرت یعقوب زنجانیؒ کو ہمعصر ٹھہرایا ہے۔ اور یہ تحریر کیا ہے۔ کہ یہ دونوں مشائخ حقیقی بھائی تھے۔ اور ساتھ ہی ساتھ تشریف لائے تھے۔ دارا شکوہ نے "سفینۃ الاولیاء" میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حالات میں یہ لکھا ہے، کہ (حضرت خواجہ در سیاحی شیخ ارزانی را دیدہ اند حضرت خواجہ نے زمانۂ سیاحت میں شیخ ارزانی سے ملاقات کی ہے) اس اختلاف کے باوجود قریب قریب تمام تذکرہ نگاروں نے اس سے اتفاق کیا ہے۔ کہ جب حضرت مخدوم سیّد علی ہجویریؒ ۴۳۱ھ میں لاہور تشریف لائے۔ تو آپ نے اپنی آمد کے پہلے ہی دن حضرت میر حسین زنجانیؒ کے جنازہ میں شرکت کی۔ اگر یہ واقعہ تسلیم کر لیا جائے۔ اور یقیناً صحیح ہے۔ اس لئے کہ اس کے قدیم ترین اور معتبر راوی حضرت سلطان نظام الدین اولیا محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ نے اپنے مُرید شیخ حسن علا سنجریؒ سے مخاطب ہو کر ایک مجلس میں یہ ارشاد فرمایا،۔

> شیخ حسین زنجانیؒ و شیخ علی ہجویریؒ ہر دو مرید یک پیر بودند و آں پیر قطب عہد بودہ است۔ حسین زنجانی دیر بار ساکن لہاور بود بعد از چندگاہ پیر شاں خواجہ علی ہجویریؒ عرضداشت کرد کہ حسین زنجانیؒ آں جاست۔ فرمود کہ تو برو، و چوں علی ہجویریؒ بحکم اشارت در لہاور آمد، شب بود بامداد اں جنازہ شیخ حسینؒ را بیروں آوردند۔ (فوائد الفواد ص۳۵)

(ترجمہ) شیخ حسین زنجانیؒ اور شیخ علی ہجویریؒ دونوں ایک پیر کے مُرید تھے۔ اور وہ پیر اپنے زمانے کا قطب ہوا ہے۔ شیخ حسین زنجانیؒ عرصہ سے لاہور میں سکونت

پذیر تھے کچھ مُدت بعد اُن کے پیر نے شیخ علی ہجویریؒ کو یہ حکم دیا۔ کہ وہ لاہور میں قیام کریں۔ شیخ علی ہجویریؒ نے عرض کیا۔ کہ وہاں تو شیخ حسین زنجانیؒ موجود ہیں۔ پیر نے حکم دیا کہ تو جا، جب شیخ علی ہجویریؒ حکم کے بموجب لاہور پہنچے، تو رات کا وقت تھا۔ صبح کو آپ نے دیکھا۔ کہ لوگ حسین زنجانیؒ کا جنازہ لئے جا رہے تھے۔

اوپر کی روایت جس بزرگ ہستی سے منسوب ہے۔ اس کی دیانت کلام میں کسی شُبہ کی گنجائش نہیں۔ ایک تو خود یہ برگزیدہ ہستی ولایت کبریٰ کے اس مقام پر فائز تھی جہاں نظر انوار الٰہیہ کا مظہر اور زبان کلام وحی و الہام کا ترجمان بن جاتی ہے۔ دوسرے اس مقدس شخصیت اور سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے درمیان صرف دو واسطے ہیں۔ ظاہر ہے حضرت محبوب الٰہیؒ نے حضرت بابا فرید شکر گنجؒ اور بواسطہ بابا حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے قدیم صوفیائے کرام کے بارے میں جو معلومات حاصل کی ہوں گی۔ اصول و روایت کی روشنی میں غیر معتبر نہیں قرار دی جا سکتیں۔ سلطان الہند خواجہ غریب نوازؒ کا زمانہ حضرت بابا فرید شکر گنجؒ نے بھی پایا ہے اس نسبت سے حضرت محبوب الٰہیؒ سلطان الہند سے اور بھی زیادہ قریب ہو جاتے ہیں کون نہیں جانتا۔ کہ حضرت خواجہ غریب نوازؒ حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار عالیہ پر معتکف رہے ہیں۔ اُن کا حجرۂ اعتکاف آج بھی اس تاریخی حقیقت کی تصدیق کرتا ہے۔ جیسا کہ بزرگانِ دین کا عام دستور رہا ہے۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے لاہور کے مزارات اور اصحاب مزارات کے حالات و واقعات کی ضرور تحقیق کی ہو گی۔ مراقبات کے ذریعہ یا لاہور کے مشائخ وقت سے۔ صدر دیوان یعقوب زنجانیؒ سے اُن کی ملاقاتیں پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہیں۔

اِس بُنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ حضرت میر حسین زنجانیؒ کی آمد لاہور کے جتنے سنین بھی بیان کئے گئے ہیں، سب غلط ہیں۔ ہم نے شروع میں جو سنہ تحریر کیا ہے، وہی صحیح ہو سکتا ہے۔ اِس حساب سے آپ ۳۶ - ۳۷ سال لاہور میں رہے۔ اور تبلیغی خدمات سرانجام دیتے رہے۔

یہ بات بھی پوشیدہ نہ رہے، کہ صدر دیوان سیّد یعقوب زنجانیؒ حضرت میر حسین زنجانیؒ کے برادرِ حقیقی نہ تھے۔ البتہ سادات زنجان سے نسبت کی بنیاد پر اُن کا شجرۂ نسب ایک ہی ہے۔

حضرت شیخ حسین زنجانیؒ کا مزار چاہ میراں میں واقع ہے۔ یہ مقام کسی زمانے میں درندوں کا مسکن تھا۔ آج سے دو تین صدی پیشتر لہنا سنگھ حاکم لاہور کے حکم سے کسی مسلمان نے اسے آباد کیا تھا۔ آج کل یہ مزار ایک باغ میں ہے۔ یہ باغ سکھوں کے زمانے میں آباد ہوا تھا۔ کہتے ہیں، اس سے پہلے بھی یہاں ایک باغ تھا۔ اور اسے باغِ زنجاںؒ کہتے تھے۔ حضرت زنجانیؒ کا مزار پہلے بے گنبد تھا۔ آجکل اُس پر نو تعمیر گنبد ہے۔ میر عبدالعزیز زنجانی اپنے قصیدہ در صفتِ لاہور میں آپ کے مزار کے بارے میں لکھتے ہیں ؎

بدرگاہِ شہنشاہِ حسین شاہِ زنجاں رو
کہ اسرارِ الٰہی در مزارِ او عیاں بینی

اے خطۂ غزنیں....!

اے خطۂ غزنیں! تیری سرزمین کے ذرّہ ذرّہ سے بُوئے محبّت آتی ہے۔ تیری خاک نے وہ گوہر آبدار اُگلا ہے۔ جس کی آب و تاب قریب قریب ایک ہزار سال سے برصغیر ہند و پاک کی نگاہیں خیرہ کر رہی ہے۔ معدنِ تصوّف کا یہ گوہر آبدار ۱۳۲ سال تیری آغوش میں رہا۔ لاہور اور اُس کی خاک کے ذرّے تیری بارگاہ ناز میں سلامِ عقیدت نذر کرتے ہیں۔ تُونے لاہور پر وہ احسانِ عظیم کیا ہے۔ کہ قیامت تک وہ اس سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ تونے لاہور کو وہ گنج گراں مایہ عطا کیا ہے۔ کہ جمشید و فریدوں کے خزانے اُس کے پاسنگ بھی نہیں۔ اے خطۂ غزنیں! یہ نہ سمجھنا کہ لاہور نے اس دولتِ سرمدی کی قدر نہیں کی۔ اس کے سینے پر ابھی تک اس کی قدر و منزلت کے نقوش کندہ ہیں۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ لاہور اُسی نعمتِ لازوال کو فراموش کر دے۔ جس کی بدولت تاریخ کے صفحات میں اُس کا نام آبِ زر سے لکھا جاتا ہے یہ گوہر آبدار! یہ گنج گراں مایہ! یہ دولتِ سرمدی! یہ نعمتِ لازوال، شخصیت ہے حضرت

مخدوم سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کی۔ آپ کے مبارک قدموں کی برکت سے لاہور کی خاک کے ذرّے آسمان کے تاروں سے آنکھیں ملا رہے ہیں ؎

چیر کر ہر خاک کے ذرّے کا سینہ دیکھئے
کون ہے ایسی جگہ جو یار کی منزل نہیں

لاہور کی فضاؤں میں جن مسیحا نفس بزرگانِ دین کے سانسوں نے روحانی حرارت سموئی ہے۔ اُن کے سرخیل حضرت مخدوم سیّد علی ہجویریؒ تھے۔ بہ اعتبار قدامت نہیں، بلکہ بلحاظ فضیلت۔ لاہور ہی نہیں، بلکہ پورا مغربی پاکستان جس میں لاہور شامل ہے۔ اس حیثیت سے ہندوپاک کے تمام مقامات پر برتری رکھتا ہے۔ کہ اس کے ایک گوشے میں اُس شیخ کامل کی آرامگاہ ہے، جس سے نہ صرف اپنے اپنے وقت کے مشائخ عظام نے بلکہ خود سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدینؒ چشتی نے بھی کسبِ فیض کیا ہے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ کی عظمت و فضیلت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ فارسی میں تصوّف کی قدیم ترین اور معرکۃ الآرا کتاب "کشف المحجوب" آپ ہی کے زورِ قلم اور حسنِ بیان کا نتیجہ ہے۔

اے خطۂ سرزمیں! تجھے حضرت مخدوم کی ذاتِ گرامی سے دیرینہ نسبت ہے۔ تجھے ان نفوسِ قدسیہ کی قسم، جو تیری آغوش میں آرام پذیر ہیں۔ لاہور کو کسی نہ کسی طرح اس جذبہ کی حقیقت سے آشنا کر دے۔ جو حضرت مخدوم کو غزنین سے کشاں کشاں لاہور لایا تھا۔ کیا یہ جذبہ تبلیغِ اسلام اور اصلاحِ اُمت کا جذبہ تھا، یا کچھ اور؟ کیا اُن کی آمد کا مقصد اصولِ اسلام کی نشر و اشاعت کے سوائے کچھ اور بھی تھا؟ اُن کی زندگی جس تصوّف کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ کیا اس کے چہرہ پر شریعت کا غازہ

چھپایا نہیں ؟۔ اگر کسی صورت لاہور پر یہ راز آشکارا ہو جائے۔ تو اس کی بگڑی بن جائے
حضرت مخدوم کے مزارِ عالیہ سے لاہور کو ہر قسم کا ظاہری و باطنی فیض پہنچ رہا ہے۔ لیکن
ایک بات ہے جو کھٹکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ سالہا سال سے کوئی ایسا اہلِ دل اس خاک سے نہیں
اُٹھا جس کی نظر کیمیا اثر کے تصرف سے اہلِ لاہور کے دل و دماغ کی دُنیا بدل جائے ؎

تماشا گاہِ عالم میں تصرّف کی ضرورت ہے
کہاں ہیں اولیاء اللہ کی شب زندہ دار آنکھیں

آلِ سبکتگین کا علمی دَور

آلِ سبکتگین کے عہدِ سلطنت کی یہ امتیازی خصوصیت ہے، کہ اُن کا عہد سیف و قلم اور قلب و نظر کی کرشمہ کاریوں کا گہوارہ رہا ہے۔ سلاطین ایسے کہ جن کے شاہی دبدبہ کا لوہا دُنیا نے مانا۔ ارباب فضل وکمال ایسے کہ جن کی عظمت وجلال کے گُن زمانہ نے گائے۔ آلِ سبکتگین کی سلطنت میں تین شہر صدر مقام تھے۔ غزنین (غزنی) دارالحکومت تھا۔ نیشاپور میں خراسان کا سپہ سالار اور لاہور میں ہندوستان کا گورنر (عامل) رہا کرتا تھا۔ یہ تینوں مقام اپنے زمانۂ عرُوج میں علم و فن کے مرکز تھے۔ نیشاپور کی علمی حالت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے، کہ دُنیائے اسلام میں سب سے پہلے نیشاپور میں مدرسہ کی داغ بیل پڑی۔ غزنویوں کے زمانہ میں یہاں کئی مدرسے جاری تھے۔ نصر بن سبکتگین کا مدرسۂ سعدیہ، امام ابن فورک کا مدرسہ نصریہ، امام ابوالقاسم کا مدرسۂ بیہقیہ وغیرہ، یہ مدرسے اس قدر وسیع پیمانے پر قائم تھے۔ کہ مؤرخین نے اُن کو "امہات المدارس" کا لقب دیا ہے۔ طغرل بیگ سلجوقی نے جب نیشاپور

فتح کیا۔ تو اُس نے بھی یہاں ایک مدرسہ تعمیر کیا۔

لاہور میں مسعود سعد سلمان اور ابوالفرج رونی کے خاندان ایک مدت سے آباد تھے۔ ابوعبداللہ النکتی اور حمیدالدین مسعود بن سعد شالی کوب لاہور کے باشندے اور فارسی زبان کے بلند پایہ شاعر تھے۔ مشہور ادیب ابونصر فارسی لاہور میں مدتوں مقیم رہا ہے۔ قیام میں اُس نے ایک مدرسہ تعمیر کرایا تھا۔ جو صدیوں قائم رہا۔ اور اس میں جاری تھی۔

غزنین کو سلطان محمود غزنوی کے دور میں چار چاند لگے۔ غزنین کی عالیشان عمارتیں یادگاریں سلطان کی تعمیری صلاحیتوں کی آئینہ دار ہیں۔ غزنین کی مساجد اور اُس کی مجموعی تعداد ۱۲ ہزار تھی۔ سلطان نے سنہ ۴۱۰ھ میں غزنین کے اندر سنگ مرمر کی ایک مسجد جامع تعمیر کرائی۔ اور اسے قسم قسم کے ساز و سامان سے زینت دی۔ سیاح اسے عروس ملک کہا کرتے تھے۔ مسجد کے پاس ایک عظیم الشان مدرسہ بنوایا۔ اس میں کتب خانہ بھی قائم کیا۔ جس میں نفیس و نادر کتابیں جمع کیں۔ مدرسے کے اخراجات کے لئے بہت سے دیہات وقف کئے۔ سلطان محمود عالم و فاضل بادشاہ تھا۔ علامہ ابوالوفا قرشی نے اسے آئمہ فقہا میں شمار کیا ہے۔ حدیث و فقہ میں اُس نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان میں "کتاب التفرید" بہت مشہور کتاب ہے۔ اور فقہ حنفی کی مستند کتب میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں ۲۰ ہزار مسائل مذکور ہیں۔ سلطان کو شعر و سخن سے بھی کافی دلچسپی تھی۔ عربی و فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہا کرتا تھا۔

سلطان محمود ارباب فضل و کمال کی کافی قدر و منزلت کرتا تھا۔ سلطان کے دربار میں ارباب کمال کا اتنا مجمع تھا۔ کہ ہارون و مامون کے علاوہ اور کسی کے دربار میں نہیں ہوا۔

سلطان کے دربار میں مناظرے بھی ہوتے تھے۔ غزنوی دور کے ایک مؤرخ یعقوب بن عثمانؒ غزنوی نے اپنی کتاب رسالہ ابدالیہ میں یہ انکشاف کیا ہے کہ ایک دفعہ سلطان محمودؒ غزنوی کی موجودگی میں غالباً مؤخر الذکر کے ایما سے حضرت مخدوم سیّد علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش رحؒ نے ہندوستان کے ایک فلسفی سے مناظرہ کیا تھا۔ اپنے بیان کے اعجاز اور اپنی شخصیت کے مقناطیسی اثر سے حضرت داتا گنج بخش رحؒ نے اس فلسفی کو اس غضب کی شکست دی۔ کہ اُس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

سلطان محمودؒ کے زمانہ میں حضرت داتا گنج بخش رحؒ زندگی کی اکیس[۲۱] بہاریں دیکھ چکے تھے سلطان کا انتقال ۴۲۱ھ میں ہوا۔ اس انتقال سے دس[۱۰] سال بعد حضرت داتا رحؒ نے عزم لاہور کیا تھا۔

داتا کے آستانے پر

ید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت داتا گنج بخشؒ کے عرفی نام
ں سے بے مثال تاریخی شخصیت کے حامل ہیں۔ فارسی میں تصوّف کی
قدیم ترین اور معرکۃ الآرا تصنیف "کشف المحجوب" آج بھی موصوف کی عظمت کی دلیل
اور کمال کی آئینہ دار ہے۔ وہ روحانی سرچشمے جن سے حضرت مخدوم کی شخصیت
نے سیرابی حاصل کی ہے۔ اور وہ نسبی واسطے جن کے سانچوں میں آپ کی
سیرت کے خدوخال ڈھلے ہیں۔ اُن کی بدولت حضرت مخدوم کو وہ مقامِ قطبیت
ملا ہے، کہ سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ آج ۹۱۰ سال کی ایک طویل مدت کے بعد
جب ایک عقیدت مند زائر کی نظر آپ کے مزار پر پڑتی ہے۔ تو بے ساختہ اُس کی
زبان سے اِن اشعار کا مفہوم ادا ہو جاتا ہے ؎

کس گھر کی یہ دہلیز ہے کس شاہ کا دربار — اجسام بھی بیدار ہیں ارواح بھی بیدار
اس روضۂ اقدس کے احاطے میں ہر اک سمت — انوار ہی انوار ہیں ، انوار ہی انوار

آنکھوں کو اجازت کہ رہیں سیر تجلّی ! — ہونٹوں کے لئے سلب مگر جرأتِ گفتار
اک کیف ہے جو آنکھ بھی اُٹھنے نہیں دیتا — اک نغمہ و مستی کا تقاضا سرِ بازار
اُٹھتی ہیں یہاں عارضِ ہستی سے نقابیں — کھُلتے ہیں نگاہوں پہ یہاں فقر کے اسرار
اک لذتِ بے نام ہے رقصاں رگ و پے میں — اک جلوۂ بے رنگ میں گم ہیں در و دیوار
یہ شان تو شاہوں میں بھی دیکھی نہیں جاتی — اللہ رے اِس مردِ حق آگاہ کا کردار

(احسان دانش)

ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ آپ کی حیاتِ باطنی کے آئینے میں وہ تمام جلوے سما گئے ہیں۔ جن سے کبھی آپ نے کسبِ نور کیا تھا۔ آپ کے مزارِ عالیہ کی زیارت سے جنیدی سلسلے کے جملہ مشائخ کرام کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اِس لئے کہ برِصغیر ہند و پاک میں موصوف کی شخصیت وہ عظیم الشان شخصیت ہے۔ جس نے جنیدی سلسلہ کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ عوام اِس لئے آپ پہ فریفتہ ہیں۔ کہ آپ کی ذات فیوض و برکات کا مرجع ہے۔ خواص اِس لئے آپ پہ جان چھڑکتے ہیں کہ آپ کی ہستی علوم و معارف کا گنجینہ ہے سہ

تو نخلِ خوش ثمرے کیستی کہ باغ و چمن !
ہمہ ز خویش بریدند و در تو پیوستند

(ترجمہ) اے اچھے اچھے پھلوں سے لدے ہوئے درخت تو کون ہے کہ باغ و چمن جہاں کہیں بھی ہیں۔ اپنی اپنی جگہوں سے اُکھڑ اُکھڑ کر تجھ میں آ ملے ہیں۔

نسب حضرت داتا حسنی سید تھے۔ آپ کا شجرۂ نسب یہ ہے۔ علی بن سید عثمان بن سید علی بن سید عبدالرحمان بن سید عبداللہ بن سید ابوالحسن علی بن سید

حسن بن حضرت زید شہید بن حضرت امام حسن بن حضرت علی المرتضیٰؓ چونکہ آنحضرت صلعم اور حضرت علیؓ چچا زاد بھائی تھے۔ اس لئے نو واسطوں سے آپ کا سلسلۂ نسب آنحضرت صلعم تک پہنچتا ہے۔

ولادت

سنۂ ولادت ۴۰۰ھ یا اس کے لگ بھگ بتایا جاتا ہے۔ آپ کی ولادت سلطان محمود غزنویؒ کے عہد میں بمقام غزنی ہوئی۔ طبقات اکبری اور تاریخ فرشتہ سے یہ ثابت ہے۔ کہ سلطان محمود کا وصال ۴۲۱ھ میں ہوا۔ اس وقت حضرت مخدوم کی عمر تقریباً ۲۱ سال تھی۔ غزنوی دور کے ایک مؤرخ یعقوب بن عثمان غزنوی نے اپنی کتاب رسالہ ابدالیہ میں (جو دسویں صدی کی تصنیف ہے) یہ انکشاف کیا ہے، کہ ایک دفعہ سلطان محمود غزنوی کی موجودگی میں غالباً موخر الذکر کے ایما سے حضرت مخدوم سید علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخشؒ نے ہندوستان کے ایک فلسفی سے مناظرہ کیا تھا۔ اپنے بیان کے اعجاز اور اپنی شخصیت کے مقناطیسی اثر سے حضرت داتا گنج بخشؒ نے اس فلسفی کو اس غضب کی شکست دی۔ کہ اس پہ گھڑوں پانی پڑ گیا۔[۱]

تعلیم و تربیت

حضرت داتا گنج بخشؒ خاندان سادات کے چشم و چراغ تھے آپ کی تعلیم و تربیت میں خاندانی روایات کی بنا پر آپ کے والد صاحب نے کافی سے زیادہ دلچسپی لی۔ ابتدائی درجہ کے علومِ دینیہ کی تحصیل کے بعد آپ نے فرغانہ، ماوراالنہر، خراسان، مرو اور آذربائیجان وغیرہ بلادِ اسلامیہ کا رُخ کیا۔ جہاں جہاں گئے، وہاں کے اربابِ کمال سے علمی استفادہ کیا۔ غزنی کے اساتذہ کے علاوہ جن مشہور علماء سے آپ نے تعلیم حاصل کی۔ اُن کے نام یہ ہیں:۔

[۱] اس واقعہ کا اعادہ نفس مضمون کی خاطر کیا ہے۔

(۱) امام ابو العباس احمد اشقانیؒ۔ (۲) شیخ ابو القاسم گورگانیؒ (۳) شیخ ابو سعید ابو الخیرؒ

رُوحانی رابطہ حضرت داتا گنج بخشؒ نے جس انداز کے علوم و معارف کا اکتساب کیا تھا۔ اُن کا تقاضا تھا۔ کہ آپ پر رُوحانیت کے دروازے بھی کھُلیں۔ حصولِ علم کا مقصد جب اپنی اِصلاح اور تبلیغ دین کا عزم ہوتا ہے۔ تو پھر طالب کا دامن گوہرِ مراد سے خالی نہیں رہتا۔ علم کا تعلق جسم سے ہو، تو دُنیا ملتی ہے۔ اور اگر اس کا رشتہ رُوح سے ہو۔ تو دین کی دَولت ہاتھ آتی ہے ؎

علم را برتن زنی مارے بود

علم را بر دل زنی یارے بود

حضرت داتا گنج بخشؒ نے قطبِ وقت حضرت شیخ ابو الفضل بن حسن ختلیؒ کے رُوحانی کمالات کے چرچے سُنے، تو آتشِ شوق کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ پہلی فرصت میں اس شیخ کامل کی زیارت کا شرف حاصل کیا۔ حضرت شیخ ختلیؒ کی نظر کیمیا اثر جو حضرت داتاؒ پر پڑی، تو جگر تک اُتر گئی ؎

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی

دونوں کو اک نظر میں رضامند کر گئی

حضرت شیخ ابو الفضل الختلیؒ کو ایک قابل مُرید ملا۔ اور حضرت داتا گنج بخشؒ کو ایک کامل مرشد، دونوں کی دِلی مُراد پوری ہو گئی۔ پیری مُریدی کا رشتہ، بیعت کے بعد اتنا استوار ہو گیا۔ کہ پیر و مُرید دونوں سفر و حضر میں ساتھ رہنے لگے۔ گھڑی بھر کے لیے بھی حضرت داتاؒ کو اپنے پیشوا کی جُدائی گوارا نہ تھی۔ ان ایّام میں حضرت داتا گنج بخشؒ نے اپنے باطنی رہنما کی ذات سے اتنا فیض حاصل کیا۔ کہ آپ کا سینہ انوار کا گنجینہ، اور

آپ کا دل اسرار کا خزینہ بن گیا تھا۔ حضرت داتا گنج بخشؒ تھوڑی سی مدت میں روحانی کمالات کے اس بلند مقام پر پہنچ گئے تھے۔ جہاں تک مرغِ تصور کی پرواز بھی نہیں ہو سکتی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے، کہ مرید نے کیا لیا اور پیر نے کیا دیا۔ شمع انجمن سے پروانے کو جو دولتِ بے بہا ملتی ہے۔ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ کسی پروانے سے پوچھو تو وہ بتائے، کہ اُسے کیا ملا ہے۔ مرغِ سحر اس داد و ستد اور اس لین دین کی حقیقت کیا جانے۔ کہاں کسی مرغ سحر کی ترانہ ریزی اور کہاں پروانہ کا سوز ؎

زروئے دوست دل دشمناں چہ دریابد

چراغ مردہ کجا شمع آفتاب کجا

حضرت سرمد مجذوبؒ نے اس لین دین کا نقشہ خوب کھینچا ہے۔ نقشہ کیسے نہ کھینچتے، ان پر جو کیفیتیں گذری تھیں۔ انہوں نے الفاظ کا لباس پہن لیا ہے۔ فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں ؎

سرمد غم عشق بوالہوس را ندہند — سوز دل پروانہ مگس را ندہند

عمرے باید کہ یار آید بکنار — ایں دولت سرمد ہمہ کس را ندہند

حضرت داتاؒ اپنے پیر و مرشد کے حضور طلب صادق اور خلوص نیت کی سوغات لے کر گئے تھے۔ وہاں سے کشف و شہود اور جذب و تصرف کے باطنی انعامات لے کر لوٹے اور لوٹنا کیسا، پیر و مرشد کی شخصیت کا کامل تصور ہمیشہ کے لئے اپنے شیشۂ دل میں اُتار لائے۔ ؎

چیر کر ہر خاک کے ذرہ کا سینہ دیکھئے — کون ہے ایسی جگہ جو یار کی منزل نہیں

حضرت داتا گنج بخشؒ نے کشف المحجوب میں اپنے پیر و مرشد کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اُن کا لُبّ لباب یہ ہے۔ کہ "طریقت میں شیخ ابوالفضل الختلیؒ میرے رہنما ہیں۔ آپ زبردست عالم تفسیر و حدیث تھے تصوف میں سلسلۂ جنیدیہ پر کاربند تھے۔ شیخ ابوالحسن حصریؒ کے مرید تھے۔ ساٹھ سال پہاڑوں میں پھرے۔ گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کی۔ آپ کی نظر تصوّف کے حقائق اور طریقت کے اِسرار و رموز پر تھی۔ صُوفیا کے لباس اور اُن کی رسوم کے پابند نہ تھے۔ بلکہ اُن کا عالم یہ تھا کہ اہلِ رسم کے ساتھ سختی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ موصُوف کی شخصیّت بارعب و جَلال تھی۔ ایک روز میں (حضرت داتا گنج بخشؒ) اپنے شیخ کے ہاتھ دُھلا رہا تھا بجلی کی سی تیزی کے ساتھ مجھے خیال پیدا ہوا۔ کہ جب ہمارے مُعاملات تقدیر کے حوالے ہیں، تو پھر کیا وجہ ہے۔ کہ قدرت نے آزاد لوگوں کو پیروں کی صحبت اور خدمت میں مقیّد کر دیا ہے۔ میرے شیخ طریقت نے میرے خیال پر اِطلاع پائی۔ اور یہ فرمایا، کہ جو خیال تمہارے دماغ میں چکر لگا رہا ہے مجھ پر روشن ہو گیا ہے۔ میرے عزیز! ہر حکم کی ایک وجہ اور ایک سبب ہوا کرتا ہے۔ جب اللہ تعالےٰ کسی کو تاج و تخت سونپنا چاہتا ہے، تو وہ اُس کی اہلیّت بھی اُس کے اندر پیدا کر دیتا ہے۔ اور وہی خدمت اُس کی بزرگی کا سبب بن جاتی ہے۔"

حضرت شیخ ابوالفضل ختلیؒ کے رُوحانی کمال اور اُن کی کرامات کے سلسلہ میں حضرت داتا گنج بخشؒ نے یہ بھی تحریر کیا ہے۔ کہ میرے شیخ فرمایا کرتے تھے۔ کہ کرامت کا اظہار کوئی اچھی چیز نہیں۔ لیکن اگر کسی ولی سے کرامت ظاہر ہو جائے۔

اپنے ارادہ سے یا بلا ارادہ، تو اُس سے اُس کی ولایت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا
حضرت داتاؒ کا بیان ہے، کہ ایک دفعہ میرے شیخ بیت الجن سے دمشق کی جانب تشریف لے جا رہے تھے۔ مَیں بھی اُن کے ہمراہ تھا۔ بارش کی وجہ سے راستہ میں جگہ جگہ کیچڑ تھا، اور راستہ طے کرنا دو بھر ہو رہا تھا۔ میری نظر جب بھی شیخ کی جانب اُٹھتی .... تو مجھے اُن کے جوتوں اور کپڑوں پر کیچڑ کی ایک چھینٹ بھی دکھائی نہ دیتی۔ جوتے بھی خشک تھے اور کپڑے بھی خشک۔ مَیں نے شیخ سے اس کا سبب دریافت کیا۔ تو فرمایا، کہ جب سے مَیں نے توکّل کے آگے ہمّت کے ہتھیار ڈالے ہیں۔ اور باطن کو وحشت سے محفوظ رکھا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے میرے قدموں کو بھی آلائش اور گند سے پاک کر دیا ہے۔

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ فرماتے ہیں، کہ میرے پیشوا اپنے مُریدوں کو کم گوئی اور کم خوابی کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ ایک جگہ کشف المحجوب کے بیسویں باب میں ہے کہ جب نیند کا پورا غلبہ ہو، تو سو رہو۔ اور جب آنکھ کھُل جائے۔ تو دوبارہ سونے کی کوشش نہ کرو۔ کیونکہ مُرید کے واسطے ایسی نیند حرام ہے، اور بیداری کا شغل ہے
حضرت خواجہ نے ۷۵ سال تک ایک ہی جامہ پہنا۔ اور آپ بے تکلّف اُس میں پیوند لگا کر پہن لیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اصلی جامہ کا نشان بھی باقی نہ رہا تھا۔

حنفی مشرب

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ حنفی المذہب تھے۔ آپ کو امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ سے خاص عقیدت تھی۔ آپ نے امام اعظم کو امام امامانِ مقتدائے سنّیاں شرف فقہا و اعز علماء کے معزز و محترم خطابات سے یاد کیا ہے۔ حضرت مخدوم نے کشف المحجوب میں ایک ایسے خواب کا ذکر کیا ہے۔ جس سے امام اعظم کی

عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت مخدومؒ فرماتے ہیں :۔

"میں ملک شام میں تھا۔ ایک دفعہ حضرت بلال حبشیؓ کے مزار کے سرہانے مجھے نیند آ گئی۔ خواب میں یہ دیکھتا ہوں، کہ میں مکہ معظمہ میں حاضر ہوں۔ اور آنحضرت صلعم باب بنی شیبہ سے داخل ہو رہے ہیں۔ اور جس طرح کوئی کسی بچے کو گود میں لئے ہوئے ہو۔ آپ ایک معمر شخص کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہیں۔ میں دوڑتا ہوا حضورؐ کی خدمت میں پہنچا۔ اور میں نے آپ کے پائے اقدس کو بوسہ دیا، اور دل میں یہ سوچنے لگا۔ کہ یہ معمر شخص کون ہے۔ آنحضرت صلعم کو میرے خیال پر اطلاع ہوئی، فرمایا کہ یہ شخص تیرا اور تیری قوم کا امام ہے۔ یعنی ابو حنیفہؒ۔ اس خواب سے مجھے اپنے اور اپنی قوم کے حق میں بڑی اُمیدیں قائم ہو گئیں۔ اور اس خواب سے مجھ پر یہ حقیقت بھی روشن ہو گئی۔ کہ امام ابو حنیفہؒ اُن لوگوں میں سے ہیں۔ جو اپنے صفاتِ ذاتی سے فانی ہو چکے ہیں۔ اور محض احکام شرح کے لئے باقی رہ گئے ہیں۔ اس لئے کہ اُن کے حامل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ اگر میں اُنہیں خود چلتے دیکھتا، تو معلوم ہوتا کہ وہ باقی الصفات ہیں۔ اور باقی الصفات کے لئے خطا و صواب دونوں کا امکان ہے، لیکن چونکہ اُنہیں حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں دیکھا۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ اُن کا وجود ذاتی فنا ہو چکا ہے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود سے باقی ہے۔ اور چونکہ خود آنحضرت صلعم کے لئے کسی طرح کی خطا کا امکان نہیں۔ اس لئے جس کا وجود اُن میں فانی ہو چکا ہے۔ وہ بھی امکان خطا سے پاک ہے"

حضرت داتاؒ کی ازدواجی زندگی

حضرت داتا گنج بخشؒ صرف صوفی صافی ہی

نہ تھے۔ بلکہ قدرت نے آپ کو ظاہری اور باطنی علوم سے بھی نوازا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ آپ شارع اسلام کی اس سُنّت کی اتباع نہ کرتے، جسے نکاح کی سُنّت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آپ نے خود بھی کشف المحجوب میں نکاح کی سُنّت پر بصیرت افروز الفاظ میں روشنی ڈالی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:۔ (۱) مرد و عورت سب پر نکاح کرنا مباح ہے۔ (۲) جو حرام سے پرہیز نہ کر سکیں، اُن پر فرض ہے۔ (۳) اور جو عیال کا حق ادا کر سکیں، اُن پر نکاح سُنّت ہے۔ نکاح کے بارے میں یہ واضح تصوّر اِس چیز کی روشن دلیل ہے، کہ آپ کو شریعت کے اصُول کی پیروی کا کتنا پاس تھا دوسرے والدین کا حکم بھی ٹالا نہیں جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ حضرت داتاؒ کی شادی کا مسئلہ خصوصاً والدین کی موجُودگی میں حل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ وہ وقت آیا۔ کہ آپ ازدواجی زندگی کی قید میں مُبتلا ہوئے۔ لیکن جلد ہی اس قید سے رہائی نصیب ہوئی۔ اور وہ اس لیئے کہ آپ کی اہلیہ کی عمر نے وفا نہیں کی۔ اپنی اہلیہ کے انتقال کے بعد پُورے گیارہ سال تجرّد کی زندگی بسر کی۔ درمیانی عرصہ میں آپ نے علُوم و معارف کی تحصیل پر اپنی عمر عزیز کا قیمتی حصّہ صرف کیا۔ آپ کی دُوسری شادی ہوئی۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس لیئے یہ رشتہ بھی دیرپا ثابت نہ ہو سکا جلد ہی اجل نے اس ازدواجی زندگی پر فنا کا پُچارا پھیر دیا۔ کتنی خُوش نصیب بیویاں تھیں۔ جنھیں قُدرت نے ایک شیخ کامل کے شرف صحبت سے نوازا۔ اور پھر اُس کی موجُودگی میں انہیں دُنیا کے خرخشوں سے نجات دی۔ اللہ تعالےٰ انہیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے ؎

جن نگاہوں نے تجھے شام و سحر دیکھا ہے اُن نگاہوں پہ فدا شمس و قمر کی آنکھیں

سیر و سیاحت

حضرت داتا گنج بخشؒ کی سیرت کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے، کہ آپ نے لاہور میں آمد سے قبل کئی اسلامی ممالک کی سیر کی ہے شام، عراق، ماوراء النہر، بغداد، پارس، قہستان، آذربائیجان، طبرستان، خوزستان، کرمان، خراسان اور ترکستان وغیرہ ممالک کی سیاحت حضرت داتا گنج بخشؒ کی کتابِ زندگی کا وہ ورق ہے، جسے ہم ریاضت و مجاہدہ کی ایک طویل داستان سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ آپ نے اِس سیاحت میں قدرت کے آثار کا مشاہدہ بھی کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اولیائے عظام اور صوفیائے کرام کی رُوح پرور صحبتوں سے بھی مستفیض ہوئے۔ خراسان میں آپ کی ملاقات تین سو مشائخ سے ہوئی۔ سفر دُوران آپ کو عجیب و غریب واقعات بھی پیش آئے۔ ایک واقعہ کا ذکر اس طرح فرماتے ہیں۔ کہ ایک دفعہ میں سُلطان العارفین حضرت بایزید بسطامیؒ کے مزارِ عالیہ پر تین ماہ تک شب و روز حاضر باش رہا۔ ہر روز میں غسل اور وضو کا اہتمام کرتا۔ مگر اس مقام کا کشف نہ ہو سکا۔ جو پہلے ایک بار ہو چکا تھا۔ آخر میں نے خُراسان کے لئے رختِ سفر باندھا۔ ایک گاؤں میں گذر ہوا۔ جہاں ایک خانقاہ بھی تھی۔ اس خانقاہ میں متر فین (نام نہاد صوفی) کی ایک جماعت نظر آئی۔ ان لوگوں نے مجھے اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ اور اپنی نگاہوں میں حقیر جانا۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے یہ بھی کہا، کہ یہ (اپنی ذات کی طرف اشارہ ہے) ہم میں سے نہیں ہے۔ اور واقعی میں اُن میں سے نہ تھا۔ انہوں نے مجھے ٹھہرنے کے لئے ایک کوٹھا دیا۔ اور وہ خُود اُس سے نیچے کوٹھے پر ٹھہرے۔ کھانے کے وقت مجھے تو سُوکھی روٹی دی، اور خُود اچھا کھانا کھایا۔ ستم یہ کیا، کہ کھانا کھانے کے بعد تمسخر سے خربوزے کے چھلکے میرے سر پر پھینکتے تھے۔ اور طنز و طعن کی

باتیں کہتے تھے۔ مگر وہ جتنا زیادہ طنز کرتے تھے۔ اُتنا ہی میرا دل اُن سے خوش ہوتا تھا یہاں تک کہ اس طنز و تمسخر سے وہ مقام کھُل گیا۔ جو اس سے پہلے نہ کھُلا تھا۔ اس سے اس بات کی علت بھی معلوم ہو گئی۔ کہ مشائخ اپنے یہاں جاہلوں کی آمد و رفت کیوں روا رکھتے ہیں۔

جب حضرت داتا گنج بخشؒ عراق میں تھے، تو آپ کو یہ سبق ملا۔ کہ عوام کی ضرورتیں رفع کرنے میں اتنی مشغولیت نہیں ہونی چاہیئے۔ کہ یادِ الہیٰ سے دل غافل ہو جائے اس قسم کی مشغولیت، ہوائے نفس کی پیروی کے سوائے اور کچھ نہیں۔ جس شخص کی قلبی حالت بہتر ہے۔ ایسے شخص کی خاطر مشغولیت کوئی عیب نہیں۔ جب اللہ تعالےٰ خود ہی اپنے بندوں کے لیئے کافی ہے، تو اُن کے لئے دُوسروں کو پریشانی مول لینے کی کیا ضرورت۔ کشف المحجوب میں حضرت داتاؒ لکھتے ہیں، کہ مخلوق سے قطع تعلق کرنا گویا بلا اور مصیبت سے چھٹکارا پانا ہے۔ انسان کے لئے ضروری ہے، کہ وہ کسی کی طرف نہ دیکھے، تاکہ دُوسرے بھی اُس کی طرف نہ دیکھیں۔ مخلوق سے اِس بے تعلقی کے باوجود حضرت داتا گنج بخشؒ بھی اپنے شیخ کی طرح اِسلام کے جماعتی نظام کے پابند رہے۔

خراسان کے سفر میں حضرت داتاؒ کا گذر ایک گاؤں سے ہوا، جسے کمندور کہتے تھے۔ وہاں آپ نے ایک شخص کو جسے ادیب کمندوری کہتے تھے، دیکھا۔ اس شخص کے بارے میں یہ سُننے میں آیا، کہ یہ بیس سال تک مسلسل پیروں کے بل کھڑا رہا ہے۔ اور سوائے تشہد کے کبھی نہیں بیٹھا۔ جب لوگوں نے اُس سے کھڑا رہنے کی وجہ معلوم کی۔ تو اُس نے جواب دیا۔ کہ ابھی مجھے وہ مقام حاصل نہیں ہوا ہے کہ میں

خُدا کا مشاہدہ بیٹھے بیٹھے کروں۔

ایک دفعہ حضرت داتا گنج بخشؒ ماوراءالنہر میں تھے۔ احمد حمادی سرخسیؒ (اُن کا مزار حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزارِ عالیہ سے متصل روضہ کے اندر ہے) آپ کے رفیق تھے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ نے اُن سے پوچھا۔ کہ تم نکاح کیوں نہیں کرتے ہو۔ تو اُنہوں نے عرض کیا، کہ اس کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اُن سے پوچھا گیا۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے۔ اِس کا جواب شیخ احمدؒ نے یہ دیا، کہ مَیں اپنے زمانہ میں یا تو اپنے آپ سے غائب ہوتا ہوں یا حاضر۔ جب غائب ہوتا ہوں، تو دونوں جہان کی مجھے خبر نہیں رہتی۔ اور جب حاضر ہوتا ہوں، تو اپنے نفس کو اِس حالت میں رکھتا ہوں۔ کہ ایک روٹی کو ہزار حوروں سے بہتر سمجھتا ہوں۔

جب حضرت داتا گنج بخشؒ مرو میں تھے، تو آپ کی ایک عالم حدیث سے ملاقات ہوئی۔ یہ عالم اپنے زمانہ کا امام تھا۔ اُس نے کہا، کہ مَیں نے سماع کے مباح ہونے پر ایک کتاب لکھی ہے۔ آپ نے کہا، اس سے بڑی خرابیاں پیدا ہوں گی تم نے امامت کے منصب پر فائز ہوتے ہوئے لہو ولعب کے مشغلہ کو جو سب گُناہوں کی جڑ ہے، حلال اور جائز قرار دیدیا ہے۔ اس امام حدیث نے بحث و تکرار کے انداز میں آپ سے خطاب کیا، کہ اگر آپ سماع کو حلال نہیں جانتے، تو آپ خُود کیوں سماع کی محفلوں میں شریک ہوتے ہیں۔ حضرت داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں، کہ مَیں نے اس کا یہ جواب دیا۔ کہ ہر شخص سماع کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اگر دل میں حلال کی تاثیر ہے، تو سماع حلال ہے۔ اور اگر حرام کی تاثیر ہے، تو سماع حرام ہے۔ اور اگر مباح کی تاثیر ہے تو پھر مباح ہے۔

آذربائیجان کے سفر کا ذکر کرتے ہوئے حضرت داتا گنج بخش ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ میں ایک دفعہ آذربائیجان کے پہاڑوں میں پھر رہا تھا۔ میں نے ایک درویش کو دیکھا، جو بہ حسرت و زاری اشعار پڑھ رہا تھا۔ شعر پڑھنے کے بعد اُس کا رنگ ایسا متغیر اور متاثر ہوا۔ کہ ایک پتھر پہ بیٹھ گیا۔ اور میرے دیکھتے دیکھتے اُس پر اتنی بیہوشی طاری ہوئی، کہ جاں بحق ہو گیا ۔

حضرت داتاؒ کے ہم عصر مشائخ

اِس عنوان کے تحت ہم اپنے قارئین کا ان مشائخ کرام سے تعارف کرانا چاہتے ہیں۔ جو حضرت داتاؒ کے معاصرین تھے۔ ان میں سے اکثر سے آپ کی ملاقاتیں بھی ہوئی ہیں :-

شام و عراق کے صوفی!

شیخ زکیؒ آپ شیخ علاؒ کے فرزند تھے۔ حضرت داتاؒ فرماتے ہیں۔ کہ ان کے دِل میں آتشِ عشق کے شعلے بھڑک رہے تھے۔

ابو جعفر محمد صیدلانیؒ شیخ مصباحؒ کے خلف الرشید تھے۔ اپنے وقت کے مشائخ میں سے تھے۔ حسین بن منصور حلاجؒ سے ان کے گہرے روابط تھے۔ آپ نے کچھ تصانیف بھی یادگار چھوڑی ہیں۔

ابوقاسم سدسیؒ آپ کا پیشہ شبّانی تھا۔ اپنے دَور میں مجاہد اور خوش وقت

شیخ ہوئے ہیں۔

ایران کے مشائخ

ابوالحسنؒ | شیخ سالبہؒ کے فرزند تھے۔ آپ اپنے وقت کے شیخ المشائخ تھے آپ کی زندگی کے دن شیراز میں بسر ہوئے۔ آپ کی وفات ۳۷۴ھ میں ہوئی ہے۔

ابواسحاقؒ | شہریارؒ کے خلف الرشید تھے۔ عوام میں آپ کا خطاب شیخ مرشد ہے۔

ابوالحسن علیؒ | بکرانؒ کے بیٹے اور شیخ طریقت تھے۔ اکابر صوفیہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اس کنیت اور اس نام کے کئی شیخ گذرے ہیں۔ حضرت داتا گنج بخشؒ بھی اسی کنیت اور اسی نام سے مشہور تھے۔

شیخ ابومسلم ہرویؒ | آپ نے طریقت کے جسم میں نئی رُوح پھونکی۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ کی ہستی وہ ہستی ہے۔ جن کے دم سے طریقت کے چراغ روشن ہوئے۔

آذربائیجان، قہستان اور طبرستان کے مشائخ

شیخ شفق فرخؒ | آپ کا مشہور و معروف نام باخی زنجانیؒ ہے۔ آپ خوش خلق اور پاکیزہ صفات شیخ تھے۔

شیخ اندرینؒ | آپ کا شمار اکابر صوفیا میں ہوتا ہے۔

شیخ عبداللہ جنیدیؒ | حضرت داتا گنج بخشؒ ان کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ میرے رفیقِ سفر بھی رہے ہیں۔ ان سے مخلوق کو کافی فیض پہنچا ہے۔ مرشد طریقت بھی تھے۔

شیخ ابوطاہرؒ | اپنے وقت کے کامل بزرگ تھے۔

خواجہ حسن سمنانیؒ | آپ صُوفی بھی تھے اور عاشق مولا بھی۔ آپ کے مجاہدے اور آپ کی ریاضات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اللہ کے شیر تھے۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی !
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رُوباہی

شیخ سہلکیؒ | ایسے شفیق اور رحیم درویش تھے۔ کہ لوگ اُن سے دلجمعی، اور بے تکلفی کے ساتھ فیض یاب ہوتے تھے۔

شیخ احمدؒ | شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کے بیٹے تھے، بڑے صالح نوجوان تھے۔ ان کی عمر نے وفا نہیں کی۔ جوانی ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ادیب کمندوریؒ | کمندور کے نامی گرامی شیخ تھے۔ ان کے مجاہدہ کی یہ کیفیت بیان کی جاتی ہے، کہ آپ بیس سال برابر کھڑے رہے تھے۔

کرمان کے اہلِ دل

خواجہ علیؒ | آپ حسین بن کلاؒ کے فرزندِ دلبند تھے۔ آپ کا شمار اُن صوفیائے کرام میں

ہوتا ہے۔ جن کا شغل سیاحت رہا ہے۔ یعنی جو وطن کی محبت کی قید سے نکل کر اجنبی علاقوں میں مجاہدے اور ریاضتیں کرتے رہے ہیں۔

شیخ محمد بن سلمہؒ | آپ بہت اونچے درجے کے شیخ تھے۔ لیکن عالم یہ تھا کہ کسی نے جانا نہ پہچانا، لوگوں میں رہتے ہوئے ان کی نگاہوں سے پوشیدہ رہے۔

خراسان کے مشائخ

ابوالعباس سرنالیؒ | آپ کو تصوف میں اجتہاد کا منصب حاصل تھا۔ مجتہد صوفی سے وہ صوفی مراد ہوتا ہے۔ جس نے کتاب تصوف میں نئے نئے ابواب کا اضافہ کیا ہو۔

خواجہ ابوجعفر محمدؒ | آپ، شیخ علی حواریؒ کے فرزند تھے۔ آپ کا تعلق گروہِ صوفیہ کے بزرگانِ دین اور طریقت کے صوفیائے محققین سے ہے۔ آپ نے اپنی تحقیق سے اِس فن میں بہت سے اضافے کئے

خواجہ ابوجعفر طرشیزیؒ | آپ اپنے دَور کے ہر دلعزیز شیخ تھے۔ عوام و خواص آپ کو آنکھوں پر بٹھاتے اور دل میں جگہ دیتے تھے اس میں کوئی شک نہیں، کہ خواجگی اِس قسم کے مشائخ کو زیب دیتی ہے۔

خواجہ محمود نیشاپوریؒ | آپ بھی پیشوائے وقت اور اپنے دَور کے مقتدا تھے نیشاپور سے آپ کی وطنی نسبت ظاہر کرتی ہے۔ کہ علوم طریقت کے علاوہ علوم شریعت پر بھی آپ کی گہری نظر ہوگی۔

شیخ محمد معشوقؒ آپ کی حیات رُوحانیت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی حیات تھی۔ آپ کی زندگی، حسن وعشق کی زندہ جاوید روایات کی بولتی چالتی تصویر تھی۔

حمزۃ المحبؒ آپ بھی باکمال درویش تھے۔ محب کا خطاب اِس بات کا ثبوت ہے، کہ آپ کی زندگی کے خمیر میں محبت کی چنگاریاں گندھی ہوئی ہوں گی۔

خواجہ رشید مظفر بن شیخ ابوسعیدؒ آپ قوم کے پیشوا اور اہلِ دِل کے مقتدا تھے۔

خواجہ شیخ احمد حماد سرخسیؒ باہمّت درویش تھے۔ آپ آخر دم تک حضرت داتا گنج بخشؒ کے رفیق رہے ہیں۔ قُدرت نے اس رفاقت پر ہمیشگی کی مہر ثبت کر دی ہے۔ آج بھی جو زائرین حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزارِ عالیہ کی زیارت کے لئے آتے ہیں۔ ان کی نگاہوں کا مرکز وہ مرقد بھی بنتا ہے۔ جو مزارِ عالیہ کے بائیں جانب گنبد کے اندر ہے۔ یہی مُرقد حضرت شیخ احمد حماد سرخسیؒ کی آرام گاہ ہے ؎

حشر تک ساتھ رہے گا تیرے دیوانوں کا
زندگی تک نہیں محدود محبت اے دوست

شیخ احمد بخارا سمرقندیؒ حضرت داتا گنج بخشؒ کی ملاقات آپ سے مرو میں ہوئی آپ کا قیام زیادہ تر وہیں رہتا تھا۔

شیخ ابوالحسنؒ آپ شیخ ابو علیؒ کے فرزند ارجمند تھے۔ بلند ہمت شیخ اور اپنے دور کے پختہ عزم صُوفی تھے۔

ماوراء النہر کے شیوخ

ابو جعفر محمد رح — شیخ حسن حرمی کے بیٹے اور اپنے وقت کے مقبول خاص و عام شیخ طریقت تھے۔ اسی نام اور اسی کنیت کے ایک شیخ خراساں میں بھی ہوتے ہیں۔

خواجہ محمد الفرمی رح — تصوف کے ساتھ ساتھ علم فقہ میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا۔ اس لئے طریقت اور شریعت دونوں کے امام تھے۔ ایک فقیہہ صوفی سے یہی توقع بھی کی جا سکتی ہے۔

احمد ایلاقی رح — اپنے وقت کے باکمال شیخ تھے۔ رسمی طریقت سے آپ کوسوں دور تھے۔

خواجہ حارث رح — آپ اپنے زمانے کے شیخ کامل تھے۔ ماوراء النہر میں اُن کی شیخیت کا طوطی بولتا تھا۔

غزنی کے صوفیائے کرام

ابوالفضل رح — آپ کے والد ماجد کا نام نامی اسدی تھا۔ مشہور و معروف بزرگ تھے۔ صاحب کرامات شیخ تھے۔ آپ نے جس دور میں زندگی بسر کی ہے۔ اُس دور کے لوگ حد درجہ گرے ہوئے تھے۔ اور شرارت اُن کی گھٹی میں تھی۔ اپنی کنیت سے مشہور تھے۔ ان کا نام نہیں معلوم ہو سکا۔

اسماعیل تاشی رح — آپ ایک مقدس اور محترم شخصیت کے حامل تھے۔ عوام سے

بچنے کے لیئے آپ نے بھی مُناسب سمجھا، کہ گروہ ملامتیہ میں شامل ہو کر زندگی بسر کریں۔ چنانچہ پُوری عمر اس شان سے بسر کر دی۔ کہ بہُت کم لوگوں نے اُن کا مقام پہچانا۔

شیخ سالار طبریؒ عالم و فاضل صوفی تھے۔ قُدرت نے آپ پر یہ احسان کیا تھا۔ کہ ظاہری و باطنی دونوں علوُم سے نوازا تھا۔ گروہ صُوفیہ میں اُن کا مقام بہُت کافی اُونچا تھا۔

ابوعبداللہ معروفؒ آپ کا شمار مست مجذوبوں میں ہوتا تھا۔ اپنے دور میں اُن کی شخصیت کا جواب نہ تھا۔ اُن کی ولایت ان کی مجذوبیت کے پردے میں چھپی رہی۔

سعید عیارؒ ابوسعیدؒ کے عالی قدر اور بلند اقبال فرزند تھے۔ آپ نے طویل عمر پائی حدیث کے حافظ تھے۔ آپ نے بہُت سے مشائخ سے ملاقاتیں کی تھیں۔ اُن کا مقام بہُت اُونچا تھا۔ لیکن لوگ آخر تک اُن کی ولایت سے بے خبر رہے۔ اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی۔

ابوالعلا عبدالرحیمؒ گروہ صُوفیہ میں ہر لحاظ بڑا اور اپنے دور کے باکمال شیخ تھے حضرت داتا گنج بخشؒ [illegible] ہیں۔ مجھے ان سے بڑا تعلق خاطر رہا ہے۔ تمام علوُم پر ان کی نظر [illegible] با وقار شیخ تھے۔

شیخ اوحدؒ شیخ محمد جزویریؒ کے بیٹے تھے۔ اہلِ طریقت سے بڑی محبت رکھتے تھے۔ اُن کی عظمت کا ثبوُت یہ ہے، کہ حضرت داتا گنج بخشؒ ایسے یکتائے روزگار شیخ نے اُن سے خصوُصی ملاقات کی۔

شیخ ابُوالقاسم گورگانیؒ آپ رئیس الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کے ساتھ

تین واسطوں سے نسبت رکھتے تھے۔ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ نے جن اصحاب کمال سے علوم و معارف کا درس لیا ہے۔ ان میں ان کا شمار بھی ہے ان کا باطنی کمال اِس درجہ بڑھا ہوا تھا۔ کہ ستون تک نے اُن سے باتیں کی ہیں۔ حضرت داتا گنج بخشؒ کا بیان ہے، کہ ایک دفعہ میں اُن سے ملاقات کے لئے اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو ستون سے ہمکلام تھے۔

شیخ ابُو القاسم قشیریؒ صاحب تصانیف بزرگ تھے۔ آپ کا سنہ وفات بھی وہی ہے، جو حضرت داتا گنج بخشؒ کا ہے۔ ابتدائے حال میں آپ کے باطنی تصرفات کا یہ عالم تھا۔ کہ اگر پتھر کو بھی ہاتھ لگا دیتے، تو جوہر بن جاتا تھا۔ آپ عربی اور فارسی کے ادیب اور شاعر بھی تھے۔ تصوّف میں آپ نے جو تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ ان سے دُنیا آج تک اِستفادہ کر رہی ہے۔ آپ کی ایک تصنیف کا نام رسالۃ القشیریہ ہے۔ یہ رسالہ ایک کھُلا خط ہے اپنے زمانے کے صُوفیا کے نام۔ سببِ تالیف یہ بیان کیا ہے۔ کہ صُوفیائے متقدمین دُنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اور ان کے اصُول بھی انہی کے ساتھ ختم ہوئے۔ اب ان کے قائم مقام جو لوگ ہیں۔ اور اُن کی جانشینی کے دعویدار ہیں، وہ عبادات سے پہلوتہی کرتے ہیں اور غفلت اور نفس پرستی کے سمندر میں بُری طرح ڈوبے ہوئے ہیں۔ حقیقت و معرفت کے میدانوں میں غضب کا سناٹا ہے۔ نہ وہ بوڑھے باقی رہے، جن کی سیرت مشعلِ ہدایت کا کام دے۔ اور نہ وہ جوان ہی باقی ہیں۔ جن کی طرف رہنمائی کے لئے رجُوع کیا جائے۔ زہد و تقویٰ کی بساط ہی اُلٹ گئی، اور حرص و طمع کا دَور آ گیا۔ شریعت کا احترام تک دِلوں سے جاتا رہا۔ اور دین کی جانب سے بے پروائی عام ہو گئی لعکام و

مسائل کی منزلت باقی نہیں رہی۔ نماز اور روزہ سے لوگوں کو ذرا بھی تعلق باقی نہیں رہا غرض جب نام نہاد صوفیہ کی اخلاقی پستی حد سے گذر گئی۔ عبادت و طاعت کی کھلے بندوں توہین ہونے لگی۔ شریعت کی خلاف ورزی پر فخر کیا جانے لگا۔ روح کے تزکیہ کا نشان تک بھی نہ رہا۔ سرتاسر نفسانیت کے تقاضے پر سے باندھے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ تو ایسی حالت میں شیخ ابوالقاسم قشیریؒ نے یہ ضروری سمجھا۔ کہ ان کے نام ایک کھلی چٹھی لکھی جائے۔ اور اس میں متقدمین کے صحیح حالات بیان کئے جائیں۔ اور اُن کے عقائد، اخلاق و عبادات وغیرہ پر روشنی ڈالی جائے۔

شیخ ابوالعباس اشقانیؒ آپ کا اصل نام احمد بن محمدؒ ہے۔ اصول فروع کے آپ امام تھے۔ بعض علوم میں حضرت داتا گنج بخشؒ نے بھی آپ سے استفادہ کیا ہے۔ شرعی علوم کے زبردست عالم تھے۔ حضرت داتاؒ کو ان سے بڑی عقیدت اور محبت تھی۔ یہ بھی ان پر شفقت فرمایا کرتے تھے۔

باب فرغانیؒ آپ کا نام نامی عمر تھا۔ فرغانہ کے رہنے والے تھے۔ فرغانہ میں حضرت داتا گنج بخشؒ نے آپ سے ملاقات کی ہے۔ آپ صاحب کرامات بزرگ تھے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ نے جن اولیاء اللہ کو زمین کی میخوں (اوتاد الارض) کے خطاب سے یاد کیا ہے۔ اُن میں ان کا شمار بھی ہوتا ہے۔

شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ آپ کا اصل نام فضل اللہ بن ابی الخیر ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ حضرت داتا گنج بخشؒ نے آپ سے بھی ظاہری و باطنی فیض حاصل کیا ہے۔ اپنے زمانے میں یکتائے روزگار تھے۔ مشائخ طریقت اُن پر جان چھڑکتے تھے۔ اُن کے پیر طریقت شیخ ابوالفضل بن حسن سرخسیؒ ہیں۔ نیشاپور میں

آپ کا قیام تھا۔ آپ نے بہت سی فارسی رباعیات بطور یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کی بعض رباعیات اوراد و وظایف میں داخل ہیں۔

حکیم سنائی غزنوی رح یہ بزرگ سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں نامی گرامی صوفی شاعر تھے۔ آپ نے طویل عمر پائی ہے۔ آپ کی تصنیف حدیقۂ سنائی مشہور و معروف ہے۔ آپ کی توبہ کا واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے، کہ سلطان محمود جب موسم سرما میں ہندوستان پر چڑھائی کے لئے آمادہ ہوئے تو حکیم سنائی نے اُن کی شان میں ایک قصیدہ کہا۔ یہ قصیدہ سنانے کے لئے آپ نے غزنی کے لئے رخت سفر باندھا۔ راستے میں ایک شراب خانے کے پاس اُن کی ملاقات ایک مجذوب سے ہوئی۔ وہ ساقی سے کہہ رہا تھا، کہ ایک جام شراب دے، تاکہ میں محمود کے نام پر چڑھا جاؤں۔ ساقی نے کہا، وہ مرد غازی ہے۔ آپ ایسا کیوں کہتے ہیں۔ مجذوب نے کہا، جو علاقے اس کے قبضے میں ہیں۔ ان کا تو انتظام کر نہیں سکتا۔ اور ملک گیری کی ہوس اُس کو جگہ جگہ لئے پھرتی ہے۔ پھر اس مجذوب نے کہا، کہ ایک جام سنائی کے نام پر پلا۔ ساقی نے کہا۔ کہ وہ تو ایک فاضل اور پاکیزہ کلام شاعر ہے۔ مجذوب نے کہا۔ کہ اگر وہ پاکیزہ کلام شاعر ہوتا۔ تو کسی اچھے کام میں مشغول ہوتا۔ وہ تو بے ہودہ گوئی میں لگا ہوا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالےٰ نے اسے کس کام کے لئے پیدا کیا ہے حکیم سنائی پر یہ باتیں سن کر لرزہ طاری ہو گیا۔ اسی وقت اُن کی حالت بدل گئی۔ اور غفلت کا دامن چاک ہو گیا۔

حضرت داتا گنج بخش رح کی تصنیفات

آپ کی تصنیفات کی تعداد دس تک پہنچتی ہے۔ لیکن قدرت کو کچھ یہی منظور تھا کہ ۹ تصانیف تو ناپید ہو گئیں۔ صرف ایک تصنیف کشف المحجوب باقی رہ گئی ہے، جو علماء میں بھی مستند مانی جاتی ہے اور صوفیہ میں بھی۔ آپ کی تصانیف کے نام یہ ہیں (۱) وجدان (فارسی دیوان کا نام ہے)۔ (۲) منہاج الدین۔ (۳) کتاب الفنا والبقا (۴) اسرار الخرق۔ (۵) کتاب البیان لاہل العیان۔ (۶) بحر القلوب۔ (۷) ایمان۔ (۸) الرعایۃ لحقوق اللہ۔ (۹) شرح کلام منصور حلاج۔ (۱۰) کشف المحجوب۔

مولانا عبدالرحمٰن جامی نے صاحب کشف المحجوب کی شان ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ:-

"عالم و عارف بود۔ در صحبت بسیارے از مشائخ دیگر رسیدہ است صاحب کتاب کشف المحجوب است کہ از کتب مشہورہ معتبرہ دریں فن است و لطائف و حقائق بسیار درآں کتاب جمع کردہ است۔"

(نفحات ص۴۵۸)

(ترجمہ) عالم بھی تھے اور عارف بھی۔ بہت سے دوسرے مشائخ سے بھی فیض صحبت پایا ہے۔ کشف المحجوب کے مصنف ہیں۔ جو اس فن کی مشہور اور معتبر کتاب ہے۔ اس کتاب میں بہت سے لطائف و حقائق جمع کر دیئے ہیں۔

دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیاء میں صاحب کشف المحجوب کے بارے میں

آپ کا قیام تھا۔ آپ نے بہت سی فارسی رباعیات بطور یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کی بعض رباعیات اوراد و وظایف میں داخل ہیں۔

حکیم سنائی غزنویؒ یہ بزرگ سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں نامی گرامی صوفی شاعر تھے۔ آپ نے طویل عمر پائی ہے۔ آپ کی تصنیف حدیقۂ سنائی مشہور و معروف ہے۔ آپ کی توبہ کا واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے، کہ سلطان محمود جب موسم سرما میں ہندوستان پر چڑھائی کے لئے آمادہ ہوئے تو حکیم سنائیؒ نے اُن کی شان میں ایک قصیدہ کہا۔ یہ قصیدہ سُنانے کے لیے آپ نے غزنی کے لئے رختِ سفر باندھا۔ راستے میں ایک شراب خانے کے پاس اُن کی ملاقات ایک مجذوب سے ہوئی۔ وہ ساقی سے کہہ رہا تھا، کہ ایک جام شراب دے تاکہ مَیں محمود کے نام پر چڑھا جاؤں۔ ساقی نے کہا، وہ مردِ غازی ہے۔ آپ ایسا کیوں کہتے ہیں۔ مجذوب نے کہا، جو علاقے اس کے قبضے میں ہیں۔ ان کا تو انتظام کر نہیں سکتا۔ اور ملک گیری کی ہوس اُس کو جگہ جگہ لئے پھرتی ہے۔ پھر اس مجذوب نے کہا، کہ ایک جام سنائیؒ کے نام پر پلا۔ ساقی نے کہا۔ کہ وہ تو ایک فاضل اور پاکیزہ کلام شاعر ہے۔ مجذوب نے کہا۔ کہ اگر وہ پاکیزہ کلام شاعر ہوتا۔ تو کسی اچھے کام میں مشغول ہوتا۔ وہ تو بے ہودہ گوئی میں لگا ہوا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالےٰ نے اسے کس کام کے لئے پیدا کیا ہے حکیم سنائیؒ پر یہ باتیں سُن کر لرزہ طاری ہو گیا۔ اسی وقت اُن کی حالت بدل گئی۔ اور غفلت کا دامن چاک ہو گیا۔

حضرت داتا گنج بخشؒ کی تصنیفات

آپ کی تصنیفات کی تعداد دس تک پہنچتی ہے۔ لیکن قدرت کو کچھ یہی منظور تھا کہ ۹ تصانیف تو ناپید ہو گئیں۔ صرف ایک تصنیف کشف المحجوب باقی رہ گئی ہے، جو علماء میں بھی مستند مانی جاتی ہے اور صوفیہ میں بھی۔ آپ کی تصانیف کے نام یہ ہیں

(۱) وجدان (فارسی دیوان کا نام ہے)۔ (۲) منہاج الدین۔ (۳) کتاب الفنا والبقا (۴) اسرار الخرق۔ (۵) کتاب البیان لاہل العیان۔ (۶) بحر القلوب۔ (۷) ایمان۔ (۸) الرعایۃ لحقوق اللہ۔ (۹) شرح کلام منصور حلاج۔ (۱۰) کشف المحجوب۔

مولانا عبدالرحمٰن جامی نے صاحب کشف المحجوب کی شان ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ:-

"عالم وعارف بود۔ در صحبت بسیارے از مشائخ دیگر رسیدہ است صاحب کتاب کشف المحجوب است کہ از کتب مشہورہ معتبرہ دریں فن است و لطائف وحقائق بسیار در آں کتاب جمع کردہ است۔"

(نفحات ص۴۵۸)

(ترجمہ) عالم بھی تھے اور عارف بھی۔ بہت سے دوسرے مشائخ سے بھی فیض صحبت پایا ہے۔ کشف المحجوب کے مصنف ہیں۔ جو اس فن کی مشہور اور معتبر کتاب ہے۔ اس کتاب میں بہت سے لطائف وحقائق جمع کر دیئے ہیں۔

دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیاء میں صاحب کشف المحجوب کے بارے میں

یہ تحریر کیا ہے، کہ:۔

"خانوادۂ ایشاں خانوادۂ زہد و تقویٰ بود حضرت پیر علی ہجویریؒ را تصانیف بسیار است۔ کشف المحجوب مشہور و معروف است و ہیچ کس را بر آں سخن نیست و مرشدے است کامل و در کتب تصوف بہ خوبی آں در زبان فارسی تصنیف نہ شدہ۔ خوارق و کرامات زیادہ از حد و نہایت و بارہا بر قدم تجرید و توکل سفر کردہ اند"

(سفینۃ الاولیا ص ۱۶۴)

(ترجمہ) آپ کا خاندان طریقت زہد و تقویٰ کا خاندان تھا۔ حضرت مخدوم علی ہجویریؒ کی بہت سی تصانیف ہیں۔ ان میں کشف المحجوب مشہور و معروف ہے۔ اور کسی کو بھی اس میں کلام نہیں ہے۔ یہ کتاب مرشدِ کامل کا حکم رکھتی ہے۔ تصوف پر فارسی میں اس سے زیادہ بہتر کوئی تصنیف نہیں۔ آپ کے خوارق و کرامات بے حد و بے حساب ہیں۔ آپ نے بارہا توکل کے سہارے سیر و سیاحت کی ہے۔

سلطان نظام الدین اولیاءؒ نے کشف المحجوب کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ:۔

"کشف المحجوب از تصنیف شیخ علی ہجویریؒ ست قدس اللہ روحہ العزیز اگر کسے را پیرے نہ باشد چوں ایں کتاب را مطالعہ کند او را پیر شود من ایں کتاب را بہ تمام مطالعہ کردم" (ورد نظامی مرتبہ شیخ علی محمود)

(ترجمہ) کشفُ المحجوب شیخ علی ہجویریؒ کی تصنیف ہے۔ اگر کسی کا کوئی پیر
نہ ہو۔ تو وہ جب اس کِتاب کا مُطالعہ کرے گا۔ تو اُس کا پیر
ظاہر ہو جائے گا۔ مَیں نے اِس کِتاب کا مکمّل مُطالعہ کِیا ہے۔

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

غزنی اور لاہور کا سیاسی پس منظر

پہلے اس سے کہ ہم حضرت داتا گنج بخش کے ورودِ لاہور کے بارے میں کچھ تحریر کریں، مناسب یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ غزنی اور لاہور کے سیاسی اور ملکی حالات سے اپنے قارئین کو روشناس کرائیں۔ اس سے اندازہ ہوگا۔ کہ جس دور میں یہ شیخِ کامل تبلیغ اسلام کے لئے کمربستہ ہوا ہے۔ وہ دور امن و سکون کا دور نہ تھا۔ اگر حضرت داتا گنج بخش ؒ مردِ مجاہد نہ ہوتے، تو زمانہ کی بے اعتدالیوں سے تنگ آ کر غزنی کے کسی گوشہ میں روپوش ہو گئے ہوتے۔ اور دُنیا کو یہ بھی خبر نہ ہوتی۔ کہ آپ کون ہیں۔ اور اپنے اندر کیا کیا صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ سب سے زیادہ نقصان لاہور کو پہنچتا۔ کیونکہ اس کے حالات آپ کے بغیر ہرگز نہیں سُدھر سکتے تھے۔ ایسا ہوتا ہی کیوں؟ قدرت نے آپ کو کمالات ہی اس لئے عطا کئے تھے۔ کہ دُنیا ان سے بہرہ ور ہو۔ اور پھر آپ کی پردہ پوشی کے بعد آپ کے مزار سے ابدی فیض جاری رہے۔ پہلے ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں۔ کہ جس سنہ میں حضرت داتا گنج بخش ؒ نے

عزمِ لاہور کیا ہے۔ غزنی میں کیا کچھ ہو رہا تھا۔

غزنی کا سیاسی ماحول

سلطان محمود غزنوی کے انتقال کے بعد غزنی کی سلطنت اُن کے بیٹوں کے ہاتھ آئی۔ یہ دونوں بیٹے امیر محمد اور امیر مسعود پانچ ماہ برابر لڑتے رہے، تاآنکہ امیر مسعود تخت نشین ہوا۔ اور امیر محمد کو اندھا کر کے قید کر دیا گیا۔ ۴۲۹ھ میں سلطان مسعود کا ہندوستان آنا غضب ہو گیا۔ پیچھے جو علاقے زیرِ نگیں تھے۔ اُن میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ سلجوقی اور ترکمان غزنی کے تخت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے۔ ۴۳۱ھ میں ترکمانوں نے چاروں طرف سے غزنی پر ہلّہ بول دیا۔ آمد و رفت کے راستے بند ہو گئے۔ خونریز جنگ تک نوبت پہنچی۔ سلطان مسعود کو اس نازک موقعہ پر اس کے سرداروں اور امیروں نے بھی دھوکہ دیا۔ وہ سب کے سب دشمنوں سے سازباز کر کے اُن سے جا ملے اِس حالت میں سلطان نے اپنے بھائی امیر محمد کے بیٹوں کو ہموار کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اُن کی خوشنودی کی خاطر اپنے بھائی کو غزنی کے قلعہ میں منتقل کیا۔ اور اُنہیں نقدی اور خلعتوں سے نوازا۔ یہاں تک کہ امیر محمد کے بڑے بیٹے امیر محمد احمد کے ساتھ اپنی بیٹی کا عقد بھی کر دیا۔ اِن انتظامات سے فراغت کے بعد اُس نے زر و جواہر لے کر ہندوستان کا رُخ کیا۔ اور اپنے جی میں یہ ٹھان لی۔ کہ وہاں سے فوج لا کر سلجوقیوں کا پوری قوت سے مقابلہ کروں گا۔ امیروں نے اسے اِس ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش بہت کی، لیکن وہ نہ مانا۔ امیر مسعود نے دریائے سندھ عبور کیا۔ اس سے یہ زبردست غلطی ہوئی کہ اُس نے خزانے کو اپنے امیروں کی تحویل میں رکھا۔ ہوا یہ کہ ایک امیر کی نیت میں فرق آگیا۔ اُسے جو موقعہ ملا۔ اُس نے

سارا خزانہ تیر کر دیا۔ اور یہ خزانہ لے کر واپس غزنی آ گیا۔ یہاں آکر اس نے امیر محمد کو اُس کی مرضی کے خلاف تخت پر بٹھا دیا۔ اور سلطان مسعود سے لڑانے کے لیئے دریائے سندھ کے پار لے گیا۔ امیر مسعود بے سروسامانی کے عالم میں گرفتار ہوا اور اُسے اُس کے بھائی کے سامنے لایا گیا۔ امیر محمد نے جان بخشی کر کے قلعہ میں قید کر دیا۔ جہاں اُسے امیر محمد احمد یعنی خود اپنے داماد کے اشارے سے قتل کر دیا گیا۔

لاہور کی سیاسی حالت

۳۶۷ھ سے پہلے کی بات ہے، کہ پنجاب، دہلی اور کالنجر وغیرہ صوبوں میں ہندوؤں کی حکومت تھی۔ امیر سبکتگین ۳۶۷ھ میں تخت نشین ہوا۔ تو اُس نے پہلے ہی سال لاہور پر چڑھائی کی۔ جس کے نتیجہ میں نہ صرف لاہور بلکہ ملتان بھی اُس کے قبضہ میں آگیا۔ ان ایام میں لاہور کا حکمران برہمن خاندان کا راجہ جے پال تھا۔ سبکتگین نے اُس کے ملک پر اُسی کی حکومت برقرار رہنے دی۔ لیکن راجہ جے پال کو کچھ اُلٹی سوجھی۔ اُس نے دریائے سندھ عبور کر کے غزنی پر حملہ کر دیا۔ بھلا جب اپنے ملک میں اُسے فتح نصیب نہ ہوئی تو یہاں کیا ہوتی۔ اُس نے شکست فاش کھائی۔ اور یہ شرط کر کے کہ مَیں بہت سے تحفے اور ہاتھی دوں گا، اپنی جان چھڑائی۔ امیر سبکتگین کے معتمد نواب خیر اللہ خاں راجہ کے ہمراہ لاہور آئے۔ راجہ نے وعدہ وفا نہیں کیا۔ بلکہ اس کے برخلاف نواب خیر اللہ خاں کی سر دربار توہین کی۔ جب یہ اطلاع غزنی پہنچی۔ تو امیر سبکتگین نے بہت بھاری فوج لے کر لاہور کا رُخ کیا۔ باوجود اس کے کہ دہلی، اجمیر، قنوج، کالنجر وغیرہ کے راجگان نے راجہ جے پال کی مدد کی۔ لیکن پھر بھی سبکتگین نے اسے شکست فاش دی۔

سبکتگین کے بعد اس کے بیٹے سلطان محمود نے ۳۹۱ھ میں لاہور پر حملہ کیا اور پھر اس پرانے دشمن راجہ جے پال کو پچھاڑا۔ اور خراج کا پختہ وعدہ لے کر اُسے رہا کیا چونکہ راجہ جے پال پے در پے شکستیں کھا چکا تھا۔ وہ مارے شرم کے جل مرا اور راج پاٹ اپنے بیٹے انند پال کو سونپ گیا۔

یہ داستان بہت طویل ہے۔ مختصراً یہ جان لیجئے کہ سلطان محمود نے حالات سے مجبور ہو کر ۴۱۲ھ میں اپنے ایک معتمد کو لاہور میں متعین کیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ پنجاب کو غزنی کا ایک صوبہ قرار دے دیا۔ لاہور کو برصغیر ہند و پاک میں سب سے پہلے اسلامی حکومت کا مرکز بننے کا شرف حاصل ہوا۔ ۴۲۲ھ میں سلطان محمود کے بیٹے سلطان مسعود کی طرف سے قاضی شیرازی لاہور کے حاکم اور تمام پنجاب کے حکمراں تھے۔ قاضی شیرازی کے بعد دو امیر اور مقرر ہوئے۔ آخر میں سلطان نے شہزادہ امیر مجدو الدین کو سپہ سالار بنا کر لاہور روانہ کیا۔ سلطان مسعود کے چھوٹے بیٹے کا نام امیر مجدود تھا۔ بہت ممکن ہے، کہ امیر مجدو الدین اور امیر مجدود دونوں ایک ہی شخصیت کے نام ہوں۔ جس زمانہ میں غزنی خانہ جنگیوں کا اکھاڑہ بنی ہوئی تھی۔ ہندوستان کے راجاؤں نے پھر سر اُبھارا۔ سازشیں اور اُس کے ساتھ ہی حملے شروع ہو گئے۔ ہانسی اور تھانیسر کے مسلمانوں کو گھیرے میں لے لیا گیا۔ محصورین نے مدد مانگی، چونکہ خانہ جنگی اور باہمی نفرت و منافرت کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ انہیں بروقت مدد نہیں پہنچی۔ بُت خانے پھر قائم ہونے لگے۔ ایک دن یہ حادثہ پیش آیا کہ مسلمانوں نے امیر مجدود کو خیمہ میں مردہ پایا۔ اس سے اُن کے حوصلے اور بھی پست ہو گئے۔

خانہ جنگی سے فائدہ اُٹھا کر پنجاب اور گردونواح کے راجے، مہاراجے، جو اسلام کے دبدبے سے سہمے ہوئے خاموش زندگی بسر کر رہے تھے۔ سرکشی اور بغاوت پر تُل گئے۔ انہوں نے دس ہزار فوج جمع کر کے لاہور کا محاصرہ کر لیا۔ مسلمانوں پر جو کچھ بیتی، اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ حالت یہ تھی کہ ؎

نہ دن کو چین آتا تھا نہ شب کو نیند آتی تھی!
کبھی اس زندگی میں رات دن ایسے بھی گذرے ہیں

مسلمان اپنی غفلت اور نا اتفاقی پر شرمسار، نادم اور پشیمان تھے۔ آخر سب نے سلطان مودود کی اطاعت پر اتفاق کیا۔ اور اس سے مدد کے طلبگار ہوئے پہلے اس سے کہ غزنی سے مدد آتی۔ اتفاق کی برکت سے اللہ تعالے نے ہندوستان کے راجاؤں میں پھوٹ ڈال دی۔ اب کیا تھا، پھر مسلمان حکمران ہو گئے۔ لاہور میں اُمرائے اسلام کی یہ حالت بتلاتی ہے۔ کہ یہاں اور تو سب کچھ ہوا۔ لیکن نہیں ہوئی تو اسلام کی تبلیغ نہیں ہوئی۔ اُمرا کو آپس کی پھوٹ اور نا اتفاقی سے فرصت ہی کہاں تھی۔ کہ وہ دین کی خدمت بھی کرتے۔ ان حالات میں اللہ تعالے کی رحمت جوش میں آئی۔ اور اُس نے اسی ملک غزنی سے جہاں کے اُمرا یہاں حکومت کرتے رہے تھے۔ ایک ایسے مرد کامل کو بھیجا۔ جس نے جسموں کے ساتھ دِلوں پر بھی حکومت کی۔ نہ صرف زندگی میں بلکہ آج تقریباً ایک ہزار سال گذر جانے کے بعد بھی ان کے انداز حکمرانی میں فرق نہیں آیا ؎

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی تمنا ہے تو دیکھ ان کو
ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

یہ مردِ کامل کون تھا؟ یہ وہی ہستی ہے۔ جسے ہم حضرت داتا گنج بخشؒ کے نام نامی سے یاد کرتے ہیں۔

حضرت داتا گنج بخشؒ کا ورُود لاہور

یہ جو مشہور ہے۔ کہ حضرت داتا گنج بخشؒ سلطان مسعود غزنوی کے ہمراہ لاہور آئے تھے: تاریخی حیثیت سے غلط ہے۔ سلطان مسعود ۴۲۱ھ میں لاہور نہیں آیا۔ اُس کی آمد ۹ ربیع الاوّل ۴۳۰ھ میں ہوئی تھی۔ دوسری بار وہ ۴۳۲ھ میں صرف دریائے سندھ تک پہنچا تھا۔ کہ اُس کی گرفتاری کا وہ واقعہ پیش آیا۔ جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ سلطان مسعود کے دونوں سفر پریشان کُن تھے۔ ایسے حالات میں عقلاً بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی، کہ اُس نے اپنے ہمراہ علماء اور صُوفیہ کے ایک گروہ کو لیا ہو۔ یا خصوصیّت کے ساتھ حضرت داتا گنج بخشؒ کو اپنے ہمراہ لیا ہو۔ دوسرے حضرت داتا گنج بخشؒ نے اپنی سیاحت کے جو واقعات جستہ جستہ بیان کئے ہیں۔ اُن سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے، کہ آپ کا سفر ایک درویش متوکل کا سفر تھا۔ ایسے سفر میں اس مزاج کے درویش تو نبھ سکتے ہیں۔ جن کی نظر اسباب سے زیادہ مسبب پر ہو۔ امیروں اور بادشاہوں کی رفاقت انہیں راس نہیں آسکتی

امیر و بادشاہ اُن کے ذوقِ سفر کی تسکین کا سامان فراہم نہیں کر سکتے۔ کشفُ المحجوب اور بعض دُوسرے تذکروں سے پتہ چلتا ہے۔ کہ حضرت داتا گنج بخش رح کے ہم سفر اور رفیقِ راہ صرف دو شخص تھے۔ اور جو آج بھی آپ کے مزارِ عالیہ کے دائیں بائیں پہلوؤں میں ابدی رفاقت کا عملی ثبوت دے رہے ہیں۔ یہ دو شخص تھے حضرت ابو سعید ہجویری رح اور حضرت شیخ احمد حماد سرخسی رح۔ حضرت ابو سعید ہجویری رح کا حال اس سے زیادہ کچھ اور معلُوم نہ ہو سکا۔ کہ آپ کو حضرت داتا گنج بخش رح نے کشفُ المحجوب میں کئی جگہ مخاطب کیا ہے۔ اور آپ ہی کے بعض استفسارات کے جواب میں کشفُ المحجوب عالمِ وجُود میں آئی ہے۔ حضرت خواجہ احمد حماد سرخسی رح وہ بزرگ ہیں۔ جن سے آپ نے ایک دفعہ دریافت فرمایا، کہ تیری توبہ کی ابتدا کس طرح ہوئی۔ تو اُنہوں نے کہا۔ کہ ایک مرتبہ میں سرخس سے روانہ ہوا۔ ایک مدت تک ایک جنگل میں اپنے اونٹوں کے ساتھ رہا۔ اس دن میں بہت خُوش ہوتا تھا۔ جب خُود بھوکا رہ کر اپنے حصّہ کی خوراک کسی مسافر یا راہ گیر کو دیا کرتا تھا۔ ایک دن ایک شیر آیا۔ اور میرے ایک اونٹ کو مار کر آپ بلندی پر جا بیٹھا، اور ایک چیخ ماری۔ جس سے گرد و نواح کے درندے لومڑی گیدڑ اور بھیڑیے وغیرہ آ گئے۔ اُن کے آنے پر شیر نے اونٹ کو پھاڑ ڈالا، اور پھر بلندی پر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد سب درندے اونٹ کا گوشت مزے سے کھانے لگے، اور خوب سیر ہو کر چلے گئے۔ پھر شیر نیچے اُترا۔ اس غرض سے کہ آپ خود بھی کچھ کھالے۔ کہ اتنے میں ایک لنگڑی لومڑی نظر آئی جو اُسی طرف آ رہی تھی۔ شیر پھر واپس چلا گیا۔ جب وہ بھی کھا کر چلی گئی۔ تو شیر نے بھی تھوڑا سا کھا لیا۔ میں دُور سے یہ کیفیّت دیکھ رہا تھا۔ شیر میرے نزدیک آیا۔ اور

خُدا کے حُکم سے گویا ہو کر یہ کہنے لگا۔ اے احمد! لقموں کا ایثار کرنا بھی کوئی ایثار ہے۔ اگر مرد ہے، تو اپنی جان کی بھی پرواہ کر۔ لقموں کا ایثار تو حیوان بھی کر سکتے ہیں۔ تُو انسان ہے۔ تجھے یہ زیبا ہے کہ تو اپنے ایثار میں انسانیت کا ثبوت دے۔ احمد حماد سرخسیؒ نے کہا، کہ جب میں نے فقیر سے یہ بات سُنی۔ تو مجھ پر ایثار کے اسرار کھلے۔ اور میں نے دُنیا کے تمام مشاغل سے توبہ کر لی۔ اور یہی دن میری توبہ کا ابتدائی دن تھا۔

یہ ہمراہی تھے، جو حضرت داتا گنج بخشؒ کے رفیقِ سفر رہے۔ تذکروں سے جہاں یہ ثابت ہے۔ کہ یہ دونوں ہمراہی لاہور آئے ہیں۔ یہ ثابت نہیں ہوتا۔ کہ یہ دونوں اس وقت بھی ہمراہ تھے، جب حضرت داتا گنج بخشؒ لاہور میں تشریف لائے۔ معلوم ہوتا ہے، کہ یہ دونوں ہمراہی کہیں راستہ میں بچھڑ گئے تھے۔ اور پھر بعد میں لاہور آ کر کچھ عرصہ کے بعد حضرت داتا گنج بخشؒ سے ملے۔

حضرت داتا گنج بخشؒ اپنی مرضی سے لاہور آئے یا اپنے پیشوا کی اجازت اور حکم سے۔ یہ مسئلہ بھی نزاعی بنا ہوا ہے۔ حضرت سُلطان نظام الدین اولیاؒ کے بیان سے یہ حقیقت واضح ہے، کہ حضرت داتا گنج بخشؒ کی لاہور میں آمد حکماً عمل میں آئی ہے۔ فوائد الفواد میں حضرتِ سُلطان محبُوبِ الٰہیؒ کا جو ملفوظ اس طرف اشارہ کرتا ہے، یہ ہے کہ:۔

"شیخ حسین زنجانیؒ و شیخ علی ہجویریؒ ہر دو مُرید یک پیر بودند، و آں پیر قطب عہد بودہ است، حسین زنجانیؒ دیر بار ساکن لہاور بود بعد از چندگاہ پیر ایشاں خواجہ علی ہجویریؒ را گفت کہ در لہاور ساکن شو۔ علی ہجویریؒ عرضداشت کرد کہ شیخ حسین زنجانی آنجا است۔ فرمود

کہ تو برو، چوں علی ہجویری رح بحکم اشارت در لہاور آمد شب بود بامداد جنازۂ شیخ حسین رح را بیروں آوردند۔ (فوائد الفواد ص۳۵)

(ترجمہ) شیخ حسین زنجانی اور شیخ علی ہجویری رح دونوں ایک پیر کے مرید تھے اور وہ پیر اپنے زمانے کا قطب ہوا ہے۔ میر حسین زنجانی رح عرصے سے لاہور میں سکونت پذیر تھے۔ کچھ عرصے کے بعد اُن کے پیر نے شیخ علی ہجویری رح کو یہ حکم دیا۔ کہ وہ لاہور میں قیام کریں۔ شیخ علی ہجویری رح نے عرض کی، کہ وہاں تو شیخ حسین زنجانی رح موجود ہیں۔ پیر نے حکم دیا۔ کہ تُو جا۔ جب شیخ علی ہجویری رح حکم کے بموجب لاہور پہنچے، تو رات کا وقت تھا۔ صبح کو آپ نے دیکھا، کہ لوگ شیخ حسین زنجانی رح کا جنازہ لئے جا رہے تھے۔

حضرت داتا گنج بخش رح ۴۳۱ھ میں غزنی سے چلے اور تقریباً ڈیڑھ برس کی مسافت کے بعد دریائے راوی کے کنارے پہنچے۔ دریا کے جس کنارے پر آپ نے پڑاؤ ڈالا۔ اس کے مشرق میں لاہور کی آبادی تھی۔ آپ نے دریا کے کنارے لاہور کے بیرونی حصے میں رات بسر کی۔ آرام سے نرم و گرم بستروں پر لیٹے ہوئے لاہور کے باشندوں کو کیا خبر تھی۔ کہ ان کا روحانی مقتدا اسی شہر کے ایک اُجاڑ گوشے میں سخت رات گزار رہا ہے۔ جس کی ہستی پر نہ صرف وہ بلکہ ان کی آئندہ نسلیں بھی فخر کریں گی۔ کون جانتا تھا کہ اس ایک رات کے بدلے میں جو یہ مرد کامل اپنی آنکھوں میں کاٹ رہا ہے۔ قدرت قیامت تک اس کے مزار پر لوگوں کو راتوں کی نیندیں حرام کر دینے پر مجبور کرے گی۔ یہ بات بھی کس کے علم میں تھی

کہ یہ مردِ خدا رات اس لیئے شہر کے باہر تنہا گذار رہا تھا۔ کہ اسے اپنے آقا کی غارِ حرا کی زندگی کا مثالی نقشہ پیش کرنا تھا۔ دُوسرے لاہور میں اُن کا دن ڈھلے پہنچنا یہ بھی ظاہر کر رہا تھا۔ کہ لاہور کی دینی و رُوحانی زندگی کا آفتاب ڈھل چُکا ہے۔ اب نئے سرے سے اُس کی رگ و پے میں زندگی کی رُوح پھونکی جائے گی۔ اور اس شان سے اس کے بام و در پہ انوار و تجلّیات کی بارش ہوگی۔ کہ لوگ چاند تاروں اور سُورج کی چمک دمک کو بھُول جائیں گے۔ صُبح سویرے آپ شہر میں داخل ہُوئے۔ اُن کے اعزاز با خیر مقدم اس اجنبی شہر کے عوام و خواص تو کیا کرتے نسیمِ سحر کے جھونکوں اور اس شہر کی خاک کے ذرّوں نے کیا ہوگا۔ ہاتفِ غیبی نے یہ آواز دی ہوگی ؎

مسندِ دولت اقبال کو خالی کر دو
آج محفل میں [illegible] آتا ہے

حضرت داتا گنج بخشؒ نے دیکھا کہ لوگ ایک جنازہ اُٹھائے چلے آ رہے ہیں۔ دریافت کرنے پہ معلوم ہوا کہ یہ حضرت میر حسین زنجانیؒ کا جنازہ ہے۔ آپ فوراً سمجھ گئے کہ پیر و مرشد کا مجھے لاہور بھیجنا اس غرض سے تھا۔ کہ میں وہ خلا پُر کروں۔ جو حضرت میر حسین زنجانیؒ کی وفات کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ آپ جنازہ کے ہمراہ ہو لیے۔ نماز جنازہ پڑھی۔ میت چاہِ میراں میں سپردِ خاک کی گئی۔ جہاں ان کا [illegible] ہے۔ (حال [illegible] کے بعد [illegible] کی از سر نو تعمیر ہوئی ہے پہلے گنبد نہ تھا اب گنبد بھی تعمیر کیا گیا ہے) حضرت داتا گنج بخشؒ نے شہر کے جنوب مغربی گوشے کا رُخ کیا۔ اور ایک بلند ٹیلے پہ جہاں ایک املی کا درخت تھا۔ آپ نے

قیام کیا۔ آج نہ یہ بلند ٹیلا ہے اور نہ املی کا درخت۔ اُن کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ایک سنگِ مرمر کا بڑا سا کٹورا مزارِ عالیہ کے شمال مغرب میں ایک دو گز کے فاصلے پر نصب ہے۔ اِس کٹورے میں ہر وقت صاف اور سُتھرا پانی بھرا رہتا ہے۔ زائرین آتے ہیں۔ اور اُنگلیوں کے پورے بھگو بھگو کر اپنی آنکھوں سے لگاتے ہیں۔

حضرت داتا گنج بخش رح کی آمد لاہور کا مقصد گوشہ نشینی نہیں تھا۔ بلکہ اسلام کی تبلیغ آپ کا نصب العین تھا۔ چنانچہ آپ نے تبلیغی جدوجہد شروع کر دی۔ چند ہی دِنوں میں آپ کی قیام گاہ پر لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ اور مخلوقِ خدا جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہونے لگی۔ چونکہ شروع سے اسلام کا مرکزی مقام مسجد رہی ہے۔ اس لئے آپ نے مسجد کی تعمیر کا بیڑا اُٹھایا۔ خود اس کا سنگِ بنیاد رکھا۔ مسجد کی تعمیر سے جہاں آپ کا مقصد مرکز کا قیام تھا۔ وہاں یہ خواہش بھی کام کر رہی تھی۔ کہ لوگوں کو نماز کے ارکان کی عملی تعلیم دیں۔ اور اُن کے اندر وہ رُوح پھونکیں۔ جسے ہم ایمان سے تعبیر کرتے ہیں۔ درس قرآن و حدیث بھی آپ کے مقاصد میں داخل تھا۔

شہزادہ دارا شکوہ سفینۃ الاولیاء میں رقمطراز ہے، کہ جب حضرت داتا گنج بخش رح نے مسجد کی تعمیر کا کام شروع کیا، تو لوگوں نے دیکھا، کہ دیگر مساجد کی بہ نسبت اُس کے قبلہ کا رُخ ذرا سا جنوب کی سمت ہٹا ہوا ہے۔ علمائے لاہور نے اس پر اعتراض کیا۔ حضرت داتا گنج بخش رح یہ اعتراض سُن کر خاموش ہو رہے۔ جب مسجد کی تعمیر سے فراغت پائی۔ تو آپ نے تمام علماء و فضلا کو دعوت دی، اور اپنی امامت میں نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد تمام حاضرین سے مخاطب ہو کر یہ فرمایا، کہ تم لوگوں کو اس مسجد کی سمتِ قبلہ پہ اعتراض تھا۔ ذرا دیکھو تو سہی قبلہ کس طرف ہے۔ جب

انہوں نے نظر اُٹھا کر دیکھا۔ تو سامنے کے تمام حجابات دُور ہو گئے۔ اور قبلہ سب کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ اس عینی مشاہدہ کے بعد معترضین کو ندامت ہوئی۔ اور آپ سے معذرت چاہی۔ یہ پہلی کرامت تھی جو لاہور میں آپ سے ظاہر ہوئی۔ اور یہی کرامت ہے، جس نے آپ کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے ہزارہا بندگانِ خدا میں سے سب سے پہلا شخص جو آپ کے دستِ اقدس پر مشرف بہ اسلام ہوا۔ وہ کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔ بلکہ سلطان مودود والیٔ کابل و غزنی کی طرف سے ولایت پنجاب کا نائب حاکم تھا۔ تحقیقاتِ چشتی اور دیگر کتبِ تاریخ میں اس شخص کا نام رائے راجو لکھا ہے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ نے اس شخص کا نام شیخ ہندی رکھا تھا۔ پنجاب کے نائب حاکم رائے راجو کو کیا خبر تھی۔ کہ ۴۳۱ھ میں اُس کی کتابِ زندگی کی ہر سطر سنہری ہو جائے گی۔ غزنی کے مردِ حق آگاہ کی ایک ہی نظر نے رائے راجو کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں آتشِ سوزِ محبت کے شرارے گھول دیئے ؎

کیا نیچے ناوکِ نظر سے دل
چوکتی ہی نہیں شکار سے آنکھ

رائے راجو حضرت داتا گنج بخشؒ کے دستِ اقدس پر نہ صرف مشرف باسلام ہوئے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے، کہ یہ داتاؒ کے ہو گئے، اور داتا اُن کے ہو گئے۔ ۴۶۵ھ میں حضرت داتا گنج بخشؒ کا وصال ہوا، تو حضرت شیخ ہندیؒ کی دبی ہوئی روحانی صلاحیتیں بیدار ہوئیں۔ جویانِ حق کے لیئے شیخ کی ذات سرچشمۂ رشد و ہدایت بن گئی۔ قاعدے کی بات ہے، کہ جب تک آفتاب عالمتاب فضائے کائنات میں

اپنی کرنوں کا نور بکھیرتا رہتا ہے۔ نہ چاند کی چاندنی نظر آتی ہے، اور نہ ستاروں کی چمک دمک، اسی حقیقت کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ حضرت داتا گنج بخش کے فیض بخش دور میں حضرت شیخ ہندیؒ کی روحانیت پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ جب آفتاب قطبیت نے ظاہر میں اپنی کرنیں سمیٹ لیں۔ اور صرف باطن میں گنج بخشی پر قناعت کی۔ تو حضرت شیخ ہندیؒ کی ولایت کے فانوس جگمگ جگمگ کرنے لگے ؎

بہارِ رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو
چمن کو یمن قدم نے ترے نہال کیا

حضرت شیخ ہندیؒ کے فیوض ولطف ذات سے پنجاب اور خصوصیت کے ساتھ لاہور کے باشندوں کو کیا کچھ فوائد حاصل ہوئے۔ ان کے بارے میں ہم اپنی محدود معلومات کے باعث کچھ نہیں تحریر کر سکتے۔ البتہ ایک واقعہ جس سے بہت کچھ نتائج نکالے جا سکتے ہیں۔ ہم اپنے قارئین کی واقفیت کے لئے تحریر کئے دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک دن ایک ہندو عورت حضرت شیخ ہندیؒ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئی۔ اور یہ عرض کیا۔ کہ میرا بچہ سخت بیمار ہے۔ اُس کی صحت کے لئے دعا فرمائیں۔ حضرت شیخ نے نہایت سنجیدگی سے ارشاد فرمایا۔ کہ اس مرض کی شافی دوا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ اس کا استعمال کر مرض جاتا رہے گا۔

ہندو عورت:۔ یہ دوا کھانے پینے کی ہے۔

شیخ:۔ کھانے پینے کی بھی ہے اور زبان سے پڑھنے اور دل میں بٹھلانے کی بھی۔

ہندو عورت:۔ میں تو اَن پڑھ ہوں، مجھے یاد کرا دیجئے۔

شیخ:۔ روزانہ آجایا کر ہم یاد کرا دیں گے۔

غرض ہندو عورت کا یہ معمول ہوگیا۔ کہ روزانہ آتی۔ اور حضرت شیخ سے کلمہ پڑھتی اور اس کے الفاظ یاد کرتی۔ چالیس دن برابر یہ ہندو عورت آتی رہی۔ شیخ کے تصرّف سے نہ صرف یہ کہ اُسے کلمہ یاد ہوگیا۔ بلکہ اُس کے دل کی دُنیا بدل گئی۔ اِس عورت نے شیخ کے دستِ حق پرست پر توبہ کی۔ اور دل و جان سے مشرف بہ اسلام ہوئی۔

بحث و نظر کی مشغولیتیں

اِس عنوان کے تحت ہم حضرت داتا گنج بخشؒ کے علم و فضل کی چند روشن اور تاریخی مثالیں پیش کرتے ہیں:۔

(۱) غزنوی دور کے ایک مورخ یعقوب بن عثمان غزنوی نے اپنی کتاب رسالہ ابدالیہ (پندرھویں صدی کی تصنیف ہے) میں یہ انکشاف کیا ہے۔ کہ ایک دفعہ سُلطان محمود غزنوی کی موجودگی میں غالباً مؤخر الذکر کے ایما سے حضرت مخدوم سید علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخشؒ نے ہندوستان کے ایک فلسفی سے مناظرہ کیا تھا۔ اپنے بیان کے اعجاز اور اپنی شخصیت کے مقناطیسی اثر سے حضرت داتا گنج بخشؒ نے اِس فلسفی کو اس غضب کی شکست دی۔ کہ اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

(اعادۂ ماسبق)

(۲) لاہور میں حضرت داتا گنج بخشؒ کا مباحثہ ایک ایسے شخص سے ہوا۔ جو تفسیر، تذکیر اور علم کا مدعی تھا۔ اُس نے فنا و بقا کے مسئلہ پر حضرت داتاؒ سے بحث کی۔ کشف المحجوب میں خود حضرت داتا گنج بخشؒ کا بیان ہے۔ کہ یہ شخص فنا و بقا کے اصول سے قطعاً نا آشنا نکلا۔ بلکہ حدوث و قدم میں بھی امتیاز نہ کرسکا۔

(۳) کشف المحجوب میں حضرت داتا گنج بخشؒ نے ملاحدہ کے ایک گروہ کا ذکر

کیا ہے جسے عرفِ عام میں سوفسطائی کہتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ ان کا مذہب یہ ہے۔ کہ علم کسی معاملہ میں اور کسی حالت میں کام نہیں آتا۔ اور جسے علم کہتے ہیں۔ اس کا وجود عدم کے برابر ہے۔ حضرت داتا گنج بخش رح نے اس گروہ سے ان الفاظ میں خطاب فرمایا ہے، کہ یہ سمجھ جس کی بنا پر تم یہ کہتے ہو، کہ علم کسی حالت میں بھی کار آمد نہیں۔ یہ صحیح ہے یا غلط؟ اگر یہ کہتے ہو، کہ تمہاری سمجھ کا فیصلہ درست ہے۔ تو پھر تم نے علم کے وجود کا اثبات لیا۔ نفی کہاں کی۔ اور اگر تم یہ کہتے ہو، کہ علم کا وجود وعدم برابر ہے، اور ہماری سمجھ کا فیصلہ درست نہیں ہے۔ پس ایسی صورت میں بحث و حجت ہی فضول ہے۔ اور ایسے شخص سے گفتگو کرنا جس کے پاس سمجھ کا مادہ نہیں بے عقلی اور بے وقوفی ہے۔ ملاحدہ کا وہ گروہ جو سوفسطائی مذہب رکھتا ہے۔ کہتا ہے، کہ ہمارا علم کسی صورت میں بھی درست نہیں ہے۔ ہٰذا ہمارا ترک علم، اثبات علم کے مترادف ہے۔ یہ بات حماقت اور جہالت کا کھلا ثبوت ہے۔ ترکِ علم دو حالتوں سے خالی نہیں ہوتا۔ یا اس کا تعلق علم سے ہوگا، یا جہالت سے، اور یہ حقیقت ہے کہ علم سے علم کی نفی نہیں ہوتی۔ کیونکہ علم، علم کی ضد نہیں ہوتا۔ علم سے علم کی نفی نہیں ہو سکتی۔ علم کی ضد تو جہالت ہے۔ یہ بات ثابت ہو گئی، کہ علم کی نفی جہالت ہے۔ اور اس کا ترک جہالت کی بنا پر ہوتا ہے۔ جاہل کی مذمت کون نہیں کرتا جہالت کفر و باطل کی ایک حالت کا نام ہے، حق کو جہالت سے تعلق کبھی نہیں ہوتا۔

(۴) حضرت داتا گنج بخش رح فرماتے ہیں، کہ ایک دفعہ ایک ظاہر بین نے جو غرور کو عزتِ علم، خواہش نفس کی اتباع کو سنتِ پیغمبری اور شیطان کی موافقت کو پیشواؤں کی خصلت سمجھتا تھا۔ بحث کے دوران میں مجھ سے کہا، کہ ملحدوں کے بارہ فرقے ہیں۔

جن میں سے ایک صوفیوں کا گروہ ہے۔ مَیں نے کہا، کہ صوفیوں میں تو ایک گروہ ملحد ہے جبکہ تم میں سے گیارہ ہیں۔ صوفی ایک فرقہ سے اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں۔ اِس لئے کہ ان میں بچنے کی صلاحیت موجود ہے۔ لیکن تم گیارہ ملحد اور زندیق فرقوں سے کیسے نجات حاصل کر سکتے ہو۔

حضرت داتا گنج بخش رحؒ کا اندازِ تبلیغ

کوئی تذکرہ ایسا نہیں ملتا۔ جس سے یہ پتہ چلے، کہ حضرت داتا گنج بخش کا اندازِ تبلیغ کیا تھا۔ کشف المحجوب کے بعض مضامین سے آپ کے تبلیغی انداز کا کچھ تھوڑا بہت اندازہ ہوتا ہے۔ ہم تبرکاً آپ کا ایک مضمون جس کی حیثیت ایک اچھے خاصے وعظ کی ہے، ذیل میں پیش کرتے ہیں :۔

ایثار کا جذبہ

اللہ تبارک وتعالےٰ کا ارشاد ہے۔ ویؤثرون علے انفسہم ولو کان بہم خصاصۃً اور وہ ایثار کی راہ اختیار کرتے ہیں، خواہ وہ خود کتنے ہی حاجتمند کیوں نہ ہوں۔ یہ آیت فقرائے صحابہ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ ایثار کی حقیقت یہ ہے، کہ جب کسی کے ساتھ ہم نشینی کا اتفاق ہو۔ تو چاہیئے۔ کہ اس کے حقوق کی رعایت اور اس کا لحاظ کیا جائے۔ اپنے فائدہ پر اس کے فائدہ کو ترجیح دے اسے راحت و آرام پہنچانے کی خاطر خود تکلیف بھی اُٹھالے، تو کوئی مضائقہ نہیں ہے اِس لئے کہ ایثار کی تعریف یہ ہے، کہ اللہ تعالےٰ کے اس حکم کی پیروی میں جو اُس نے اپنے حبیبِ لبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا ہے۔ دوسروں کی مدد اور اُن کے ساتھ تعاون کے لئے ہر وقت آمادہ رہے۔ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔ خذ العفو وامر بالعرف واعرض عن الجاھلین۔ دوسروں کی خطاؤں سے درگذر کر۔ نیکی کی تعلیم دے

اور جاہلوں سے مُنہ موڑ۔ ایثار کی دو صورتیں ہیں۔ (۱) ایثار صحبت۔ (۲) ایثار محبت۔ صحبت میں جو ایثار ہوتا ہے۔ اس میں رنج و کلفت سے سابقہ پڑتا ہے۔ جبکہ ایثار محبت میں راحت ہی راحت ہوتی ہے۔ ابُوالحسن احمد نوریؒ، رقامؒ اور ابوحمزہؒ، ان نیک دل لوگوں کے سرگروہ اور امام گذرے ہیں۔ جو دوسروں کی مصلحت اور منفعت پر اپنی مصلحت اور منفعت کو قربان کر دیا کرتے تھے۔ خلیفۂ وقت کے ایک غلام خلیلؔ کو ان سے خُدا واسطے کا بَیر ہو گیا۔ اُس نے خلیفہ کے کانوں میں ان کیخلاف زہر گھولا، اور یہ شکایت کی، کہ یہ وہ لوگ ہیں۔ جن کے باعث دین میں طرح طرح کی خرابیاں راہ پا گئی ہیں۔ ان کے خیالات میں بے دینی کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اگر خلیفہ انہیں قتل کرا دے۔ تو بے دینی کی جڑ کٹ جائے گی۔ کیونکہ بے دینوں کے سب سے بڑے سردار یہی ہیں۔ خلیفہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، فوراً اُن کے قتل کا حکم صادر کر دیا۔ جلاّد آئے، اور ان تینوں کے ہاتھ باندھ کر مقتل میں لایا گیا۔ جب رقامؒ کو قتل کرنے لگے۔ تو نوریؔ اُٹھا، اور کہا کہ پہلے میرا حق ہے۔ جلاّدوں نے کہا۔ کیا تلوار میں ایسی ہی لذّت ہے، کہ تو قتل ہونے کی تمنّا کرتا ہے۔ جواب دیا۔ بے شک اس میں ایسی ہی لذّت ہے۔ میرا طریقہ اور اصول ایثار ہے۔ مجھے دُنیا میں سب سے زیادہ محبّت اپنی جان سے ہے۔ مَیں چاہتا ہوں، کہ یہ جان اپنے بھائیوں کی خاطر صرف کر دوں۔ کیونکہ دُوسرے جہان میں، جہاں خدمت نہیں، بلکہ قربت ہوتی ہے۔ ایثار کی لذّت میسّر نہیں آئے گی۔ سرکاری قاصد نے اس عجیب واقعہ سے خلیفہ کو مطلع کیا۔ خلیفہ کو اس عجیب واقعہ سے بڑی حیرت ہوئی۔ اور اُس نے جلاّدوں کے پاس یہ حکم بھیج دیا۔ کہ اُن کے قتل کے بارے میں توقّف سے کام لو۔

خلیفہ نے اپنے قاضی القضاۃ ابوالعباس بن علی کو اس کام پر مامور کیا۔ کہ وہ اُن کے حالات کا جائزہ لے۔ قاضی القضاۃ ان تینوں کو اپنے مکان پر لے گئے۔ اور ان سے مختلف سوالات کئے۔ جب یہ دیکھا، کہ ان میں اور ان کے کلام میں کوئی بے دینی کی بات نہیں ہے، تو انہیں (قاضی القضاۃ کو) اس بات پر سخت ندامت ہوئی۔ کہ میں نے بڑی غلطی کی، کہ ان کے حال سے بے خبر رہا۔ ابوالحسن نوریؒ نے کہا اے قاضی تو نے جو ہم سے یہ سوالات کئے ہیں۔ یہ تو کچھ بھی نہیں ہیں، کچھ اور پوچھا ہوتا۔ تو نہیں جانتا کہ اللہ تعالےٰ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں۔ جن کا کھانا، پینا بیٹھنا اور بولنا سب اسی ایک خدا کی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ خدا کے جلوے دیکھ کر جیتے ہیں۔ اگر ایک گھڑی کے لئے بھی وہ مشاہدۂ تجلّی سے محروم ہو جائیں۔ تو وہ اودھم مچا دیتے ہیں۔ اور اُن کی دُنیا میں شور برپا ہو جاتا ہے۔ قاضی کو اس گفتگو سے اور بھی زیادہ تعجب ہوا۔ اور اُس نے خلیفہ کو یہ تحریر بھیجی۔ کہ اگر یہ لوگ ملاحدہ (بے دین) ہیں۔ تو پھر موحّد کون ہے۔ خلیفہ نے انہیں اپنے پاس بُلایا۔ اور کہا کہ مجھ سے کوئی اپنی حاجت بیان کرو۔ ان سب نے کہا، کہ ہماری حاجت یہ ہے کہ تو ہمیں بھول جا۔

نافعؒ کی روایت ہے، کہ ابن عمرؓ کو ایک دفعہ مچھلی کھانے کی خواہش نے ستایا۔ بہت کچھ جستجو اور تلاش کے بعد مچھلی ملی۔ اُسے بھون کر اُن کے سامنے لایا گیا۔ انہیں یہ دیکھ کر قلبی مسرّت ہوئی۔ ٹھیک اسی وقت دروازے پر ایک سوالی آگیا۔ ابن عمرؓ نے کہا۔ یہ بھُنی ہوئی مچھلی اسے دیدو۔ غلام موجود تھا۔ اُس نے کہا۔ حضرت ایک مدّت سے آپ کے دل میں مچھلی کھانے کی خواہش چٹکیاں لے

رہی تھی۔ آج جب خدا نے یہ خواہش پوری کی ہے۔ آپ اسے فقیر کے حوالے کر دیتے ہیں۔ فقیر کو کوئی اور چیز دے دی جائے گی۔ ابن عمرؓ نے فرمایا۔ کیا تو نے آنحضرت صلعم کی حدیث نہیں سُنی۔ آپ فرماتے ہیں۔ کہ جس چیز کو خواہش سے حاصل کرو۔ اُس سے ہاتھ اُٹھا لو۔

دس درویش ہم سفر تھے۔ ایک جنگل میں راستہ بھول گئے۔ اُنہیں پیاس نے سخت ستایا۔ پانی جو اُن کے پاس تھا۔ وہ صرف اتنی مقدار میں تھا۔ کہ اُس سے صرف ایک آدمی کی پیاس بجھ سکتی تھی۔ انہوں نے یہ ایثار کیا، کہ اپنی اپنی خواہشوں کو ایک دُوسرے کی خواہش پر قربان کیا، نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ایک کے سوا سب پیاسے مر گئے۔ دسویں آدمی نے پانی پی لیا۔ اور اُس کی قوت سے گرتا پڑتا جنگل سے باہر نکلا۔ ایک شخص سے اُس نے یہ سب ماجرا بیان کیا۔ اُس نے کہا، کہ اگر تو بھی پانی نہ پیتا، تو اچھا ہوتا۔ اُس نے کہا، اگر میں نے پانی نہ پیا ہوتا۔ تو مجھ پر خود کشی کا جرم عائد ہوتا۔ اور عاقبت میں مجھ سے مواخذہ ہوتا۔ کہنے والے نے کہا پھر وہ نو آدمی جنھوں نے پانی نہیں پیا ہے۔ اُنہوں نے بھی خود کشی کے جُرم کا ارتکاب کیا ہے۔ کیا اُن سب سے جواب دہی ہو گی۔ اُس نے کہا، نہیں تو، وہ سب شہید ہیں۔ اِس لیئے کہ اُن میں سے ہر ایک نے دُوسرے کی جان بچانے کیلئے خود موت قبول کی ہے۔ لیکن جب وہ ایک دُوسرے پر قربان ہو کر چل بسے اور صرف میں اکیلا رہ گیا، تو شریعت نے مجھ پر یہ واجب کر دیا، کہ میں پانی پی لوں۔ اور اپنے آپ کو جان بُوجھ کر بغیر کسی مقصد کے ہلاکت میں نہ ڈالوں۔ اگر میں بھی پانی نہ پیتا۔ تو ظاہر ہے۔ میں بھی مر جاتا۔ اور چونکہ گیارھواں آدمی کوئی نہ تھا۔ جس کے لئے میں

ایثار کرتا۔ اِس لئے میری موت حرام ہوتی۔ اور اسے خودکشی سے تعبیر کیا جاتا۔ اللہ اللہ! یہ زندگی تھی مردانِ خُدا کی۔

جس شب کو کفارِ مکّہ نے آنحضرت صلعم کے قتل کے منصوبے باندھے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اُن کے بستر پر جا سوئے۔ اسی طرح غارِ ثور میں حضرت صدیق اکبرؓ نے بھی آنحضرت صلعم کی خاطر اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھا تھا غزوہ اُحد کا حادثہ بھی کافی مشہور ہے۔ اس میں اللہ تعالٰے نے اپنے بندوں کی کڑی آزمائش لی تھی۔ اور اس آزمائش میں جب وہ پُورے اُترے۔ تو پھر اس آیت میں (ویوثرون علیٰ انفسہم ولوکان بہم خصاصہ) ان کی تعریف بھی کی ہے۔

اس غزوہ اُحد کی بات ہے، کہ ایک انصاری خاتون کوئی خدمت کرنا چاہتی تھی۔ جب وہ میدانِ جنگ میں پہنچی، تو اُس نے دیکھا۔ کہ چند آدمی زخمی پڑے ہیں۔ اُن میں سے ایک دم توڑ رہا تھا۔ وہ عورت اُس کے پاس پانی لائی۔ اُس زخمی نے دوسرے کی طرف اِشارہ کیا۔ اور کہا کہ پہلے اُسے پلا۔ یہ کُل سات آدمی تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے اشارہ سے یہی کہا۔ اور ہوا یہ کہ جب عورت پانی لے کر پھر پہلے آدمی کے پاس پہنچی۔ تو وہ جانِ جاں آفریں کو سونپ چُکا تھا۔ جب واپس لوٹی، اور دوسروں کے پاس پہنچی۔ تو اُن میں سے بھی کوئی زندہ نہ تھا۔ کیا ایثار کی اس سے بڑی کوئی اور مثال ہو سکتی ہے۔

ایک عابد سے کوئی خطا سرزد ہو گئی۔ اُدھر سے خطاب ہوا۔ کہ اس کا نام اشقیا کی فہرست میں شامل کر دیا گیا ہے۔ عابد نے کہا کہ خُدایا! اگر دوزخ ہی میں بھیجنا مقصود ہے، تو ایسا کر کہ سب دوزخیوں کی جگہ مجھے ہی بھیج دے۔ تاکہ دُوسروں کو

میری ذات سے کوئی فائدہ تو پہنچے۔ حکم ہوا ہماری ناراضگی صرف ایک آزمائش تھی۔

ابوالحسن نوریؒ بھی بالعموم یہی دُعا مانگتے تھے۔ کہ باالٰہی ہر چیز خواہ بُری ہے یا بھلی۔ تیرے علم، تیری قُدرت اور تیرے ارادے سے دُنیا میں ہے۔ اگر تُو دوزخ کو بھرنا ہی چاہتا ہے۔ تو اس میں سب کی جگہ اکیلا مجھے ڈال دے۔ اور دوزخیوں کو دوزخ کی آگ سے نجات دے۔

حضرت داتا کی خدمت میں ایک مروزی نوجوان

"اسرارِ خودی" میں علامہ اقبال نے یہ واقعہ نظم کیا ہے۔ کہ ایک دفعہ ایک نوجوان جس کا تعلق مرو (ترکستان) سے تھا۔ حضرت داتا گنج بخشؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کی کہ حضور! میں دشمنوں کے نرغہ میں گھرا ہوا ہوں۔ کوئی ایسی راہ تجویز فرمائیں۔ کہ دشمن مجھے کوئی گزند اور کوئی تکلیف نہ پہنچا سکیں۔ اس پر حضرت داتا گنج بخشؒ نے ارشاد فرمایا کہ ؎

فارغ از اندیشۂ اغیار شو

قوتِ خوابیدۂ بیدار شو

تُو اغیار کے خوف و خطر کو اپنے دِل میں راہ نہ دے۔ دِل سے یہ اندیشہ نکال دے۔ تو ایک سوئی ہوئی قوت ہے۔ بیدار ہو کر اپنی شان دیکھ۔ یعنی دِل سے خیال نکال دے۔ کہ دشمن تیرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ تیری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ تیری وہ صلاحیتیں جن پر غفلت کے غلاف چڑھے ہوئے ہیں اُجاگر ہوں ؎

سنگ چوں بر خود گمان شیشہ کرد!

شیشہ گردید و شکستن پیشہ کرد

اگر تھر اپنے بارے میں یہ گمان کرلے، کہ میں شیشہ ہوں، تو رفتہ رفتہ اس میں شیشہ کی سی صفات پیدا ہو جائیں گی۔ اور ہر شخص اسے توڑ سکے گا۔ یعنی ساری خرابیاں یقین کی کمزوری اور اپنے اوپر بھروسہ نہ کرنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ جو لوگ خود اعتمادی کے جوہر سے ناآشنا ہیں۔ اور جو یقین کی دولت سے مالامال نہیں ہیں وہ دنیا میں کبھی فتح و کامرانی اور عزت و آبرو کی زندگی بسر نہیں کر سکتے ؎

ناتواں خود را اگر رہرو شمرد

نقدِ جان خویش با رہزن سپرد

اگر کوئی رہرو اپنے آپ کو کمزور سمجھتا ہے۔ تو یقیناً راستے میں اس کے لٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ کسی قیمت پر بھی اپنے ضعف کے احساس کو غالب نہیں ہونے دینا چاہیئے۔ عالی ہمت لوگ اسے موت سے تعبیر کرتے ہیں ؎

تا کجا خود را شماری ماء و طین

از گلِ خود شعلۂ طور آفریں

تو کب تک اپنے آپ کو مٹی اور پانی سے مرکب شے تصور کرتا رہے گا۔ تجھ پر لازم ہے، کہ تو اپنی شخصیت کا معیار اتنا بلند کرلے۔ کہ اس سے شعلۂ طور پیدا ہو ؎

با عزیزاں سرگراں بودن چرا

شکوہ سنج دشمناں بودن چرا

رشتہ داروں کا گلہ شکوہ بے سود ہے۔ اور دشمنوں کی شکایت بالکل بے فائدہ ہے۔ ایک انسان کو چاہیئے۔ کہ وہ رشتہ داروں اور دشمنوں سے

بے نیاز ہو کر زندگی بسر کرے ؎

راست می گویم عدو ہم یار تست
ہستیٔ او رونقِ بازار تست

مَیں تجھ سے سچ کہتا ہوں۔ کہ دشمن بھی تیرا دوست ہے کیوں ؟ اس لئے کہ اُس کے دَم سے تیری زندگی میں ہماہمی اور سرگرمی پائی جاتی ہے۔ ؎

ہر کہ دانائے مقاماتِ خودی ست
فضلِ حق داند اگر دشمن قوی ست

جو شخص خُودی کے مقامات سے آگاہ ہے۔ وہ تو اِس بات کو خُدا کی مہربانی تصوّر کرتا ہے، کہ اُسے کسی زبردست دشمن سے سابقہ پڑ جائے۔ کیونکہ اس سے اُسے اپنی مخفی قوّتوں کو بیدار کر لینے کا موقعہ ملے گا ؎

کشتِ انساں را عدو باشد سحاب　　ممکناتش را بر انگیزد ز خواب

اِنسان کی زندگی کی کھیتی کے لیئے دُشمن بادل کا کام دیتا ہے۔ اور اِنسان کی مخفی اور سوئی ہوئی قوّتوں کے بیدار ہونے کا سبب بنتا ہے۔ اگر مینہ نہ برسے تو کھیتی سُوکھ جائے ؎

سنگِ رہ آب است اگر ہمت قوی ست　　سیل را پست و بلند جادہ چیست

اگر انسان کی ہمّت بلند ہو۔ تو راستہ کا پتھر پانی کی طرح بہہ جاتا ہے یقین نہ ہو، تو تجربہ کر لو۔ جس وقت سیلاب آتا ہے۔ اس کے سامنے پستی و بلندی دونوں کی حیثیت یکساں ہوتی ہے۔ بڑے سے بڑے دَرخت جڑ سے اُکھاڑ پھینکتا ہے۔ اور خار و خس کی طرح انہیں اپنی رَو میں بہا لے جاتا ہے۔

حضرت داتا گنج بخش رح کے ارشادات

(۱) انسان کے لئے سب سے مشکل اور دشوار کام خدا کی معرفت ہے۔
(اس سے ہمیں یہ سمجھنا چاہیئے، کہ خدا کا قرب اور اُس کی معرفت حاصل کرنے کیلئے سخت سے سخت مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ جب تک نفس کی خواہشات قربان نہیں کی جائیں گی، مقصود ہاتھ نہیں آسکتا۔ آجکل لوگ ہر کسی کو عارف باللہ کہہ دیتے ہیں کم سے کم یہ تو دیکھ لینا چاہیئے، کہ اس کی زندگی کے کسی حصّہ میں مجاہدانہ روایات بھی ہیں یا نہیں۔ ؎

یہ شہادت گہہ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مُسلماں ہونا)

(۲) خُدا کے راستہ پر چلنے والوں کا پہلا مقام توبہ ہے۔ گویا یہ سمجھنا چاہیئے کہ خُداوند قدوس کی بارگاہ میں جس دروازے سے کوئی داخل ہوسکتا ہے۔ وہ توبہ ہے۔ توبہ کے معنی پورے طور پر رجُوع ہونے کے ہیں۔ جب ایک مردِ مومن

اس منزل میں پہنچتا ہے تو اُسے اپنے ماضی کے افعال پر ندامت ہوتی ہے۔
اور حال میں وہ یہ بات اپنے جی میں ٹھان لیتا ہے کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ میں
اب دوبارہ ان افعال کا ارتکاب نہیں کروں گا۔ مستقبل میں اس کا عمل اس کا
روشن ثبوت پیش کرتا ہے۔

(۳) اللہ کی معرفت دل کی زندگی اور ماسوا سے منہ موڑ لینا ہے۔ اگر دل
زندہ نہ ہو اور ماسوا سے گہرا تعلق ہو، تو معرفت کی ہوا بھی نہیں لگ سکتی۔ سالک
کی دل کی بیداری کا ہے۔ وہ ہمیشہ اس سے لگا رہے کہ کسی کا وصل اس دل میں نہ
آنے پائے۔ اگر اس کیفیت کے ساتھ ذاتِ باری کا تصور اور وہ رخ کے آئینہ پر
نقش ہو جائے۔ اور جب [illegible] ہر چیز سے [illegible] جتنی بھی ہماری مرغوبات ہیں۔
ان سے شوق سے بہت تعلق رکھے [illegible]
بے نام ہو جاتے [illegible]

(۴) شخص کی ادب و قیمت کا معیار [illegible] ہے جسے معرفت [illegible] حاصل
نہ ہو، اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جتنا زیادہ کسی کو
اللہ تعالیٰ کا عرفان حاصل ہوگا۔ اتنا ہی زیادہ وہ معزز و محترم ہوگا۔ عارف کی
تعریف ہی یہ ہے کہ اس کی شخصیت خداوندی صفات کی حامل ہو۔ اور جب یہ
مجسم ہستی میں بھی خداوندی صفات ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ اپنی عظمت و کبریائی کا پرتو
اس پر بھی ڈال دے گا۔ مخلوق کی گردنیں اس کے سامنے جھک جائیں گی۔ اور وہ
جہاں کہیں بھی اور جس حال میں بھی ہوگا۔ زمین کے ذرے اور آسمان کے تارے
اس کا خیر مقدم کریں گے۔ خود حضرت داتا گنج بخش کی شان سے پہلے غزنی سے

چل کر لاہور پہنچے۔ یہاں کسی سے جان تھی نہ پہچان، لیکن دیکھنے والی آنکھیں دیکھ رہی ہیں، کہ لوگ اس شمع ولایت پر پروانہ وار نثار ہو رہے ہیں۔ حضرت داتاؒ کی شخصیت میں آخر کون سا ایسا وصف تھا، کہ عوام و خواص کی عقیدتیں ان کی ذات سے وابستہ ہو گئی ہیں۔ یہ وصف تھا حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی معرفت)

(۵) غافلین کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے، کہ اُن کی نظر اپنے محبوب پر نہیں ہوتی۔ (وہ لوگ دھوکے میں ہیں، جو خود اپنے اندر کوئی خوبی نہ رکھنے کے باوجود یہ سمجھتے ہیں، کہ وہ بہت کچھ ہیں۔ اور دنیا میں جو دوسری مخلوق بس رہی ہے، وہ خوبیوں میں اُن کی برابری نہیں کر سکتی۔ یہ وہ لوگ ہیں، جو کبھی اپنے گریبان میں مُنہ ڈال کر بھی نہیں دیکھتے۔ بس اُن کا شغل یہ ہے، کہ دُوسروں میں کیڑے نکالتے رہتے ہیں)

(۶) انسان کی نجات دین کی اطاعت میں ہے۔ اور اُس کی تباہی اُس کی خلاف ورزی میں۔ (دین سے مراد وہ خُداوندی ضابطہ ہے، جو بندوں کی ہدایت کے لئے مرتب کیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص اس ضابطہ کی دفعات پر جزوی اور کُلی طور پر عمل نہیں کرتا، تو اس کے معنی یہ ہیں، کہ وہ سرکش اور باغی ہے۔ اس کی نجات کیسے ممکن ہو سکتی ہے۔ نجات کے مستحق اور حق دار تو وہی لوگ ہیں۔ جو فرمانبرداری اور اطاعت کیشی کا نظری ثبوت بھی دیتے ہیں اور عملی بھی)

(۷) عمل، علم کا محتاج ہے۔ اور علم، عمل کا حاجتمند۔ (ایک مسلمان کی زندگی کا کمال یہی ہے، کہ اس میں علم و عمل کی ہم آہنگی ہو۔ عمل کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو۔ علم کی روشنی کے بغیر فائدہ مند نہیں ہوتا۔ اس کی مثال یہ سمجھیئے، کہ کوئی شخص جسے عمل کی

دُشمن ہے۔ ہر وقت اور ہر جگہ نماز ہی پڑھتا رہتا ہے، یا ہر روز روزہ سے رہتا ہے
عید کے دن بھی، جب سب لوگ کھاتے پیتے ہیں۔ وہ اپنا منہ بند رکھنا، یا اپنی
ساری کمائی زکوٰۃ، صدقات اور خیرات میں دے دیتا ہے، یا ہر ماہ حج کی نیت سے
بیت اللہ کا سفر کرتا ہے۔ یا بغیر کسی مصلحت کے جہاد کے لئے ہر وقت آمادہ رہتا
ہے۔ کیا ایسے عامل کو اُس کے عمل کا اجر و ثواب مل سکتا ہے؟۔ نہیں، ہرگز نہیں
اور وہ اس لئے کہ اُس نے عمل تو کیا، لیکن ان احکام کے ماتحت نہیں کیا، جو خدا و
رسُولؐ نے نافذ کئے ہیں۔ اس کی تمام جد و جہد اور کد و کاوش اکارت گئی۔ اگر وہ
اِس عمل سے بے عمل ہی رہتا۔ تو کچھ اُجر کی توقع ہو بھی سکتی تھی۔ اِس سے ثابت
ہوا۔ کہ عمل کسی کے حکم کے تابع ہے۔ اور اس حکم کو جاننے کا ذریعہ صرف عِلم ہے
اسی طرح وہ عِلم بھی بیکار ہے۔ جس کے ساتھ عمل نہ ہو۔ کسی چیز کا جان لینا کافی
نہیں ہوتا۔)

(۸) ہر کام کی ابتدا میں نیت کر لینا اس کام کا حق ادا کرنا ہے (قرآن کریم اور
حدیث شریف سے ثابت ہے، کہ ہمارے اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے۔ اگر نیت
دُرست ہے تو عمل بھی درست ہے۔ اور اگر نیت میں کھوٹ ہے، تو پھر عمل بھی
ناقص ہے۔ نیت سے عمل کا رُخ بدل جاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی روزہ دار روزہ کی نیت
کئے بغیر کچھ نہیں کھلائے پیئے گا۔ تو یہ نہ کھانا پینا فاقہ کہلائے گا۔ اسے روزہ نہیں
کہا جا سکتا۔ نیت سے ایک مسافر مقیم بن جاتا ہے، اور ایک مقیم مسافر)

(۹) جس کام میں نفسانی خواہش آجائے۔ اس سے برکت جاتی رہتی ہے۔
(نفسانی خواہش ایک قسم کی خود غرضی ہوتی ہے۔ جب یہ خواہش کسی انسان کے دل و

دماغ پر غلبہ پالیتی ہے۔ تو پھر اس کے اندر فرعونیت آجاتی ہے۔ اور وہ کسی کو اپنی خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ جو کام بھی کرتا ہے۔ صرف اپنے ہی فائدے کی خاطر کرتا ہے اسے دُوسروں کے فائدے سے متعلق کوئی غرض اور واسطہ نہیں ہوتا۔ خواہشیں جتنی زیادہ ہوں گی۔ اُن سے خرابیاں ہی پیدا ہوں گی۔ اللہ تعالےٰ کی وہ نعمت جسے ہم برکت سے تعبیر کرتے ہیں۔ کسی چیز میں اُسی وقت تک رہتی ہے۔ جب تک خواہشیں راہ نہیں پاتیں۔ جہاں نفسانی خواہشات کی پرچھائیں اُس پر پڑیں۔ سارا کھیل بگڑ جاتا ہے ؎

خواہشوں نے ڈبو دیا دل کو

ورنہ یہ بحرِ بیکراں ہوتا!)

(۱۰) جب نفس کسی انسان کے تابع بن جاتا ہے، تو کھانا پینا بھی عبادت بن جاتا ہے۔ (سارا کمال نفس پر قابو اور غلبہ پانا ہے۔ جب اللہ تعالےٰ کی توفیق اور اُس کی عنایت سے یہ نفس سرکش زیر ہو جاتا ہے، تو پھر ایک انسان جو کام بھی کرتا ہے۔ اس میں قرینہ اور سلیقہ آجاتا ہے۔ اور وہ اِس لئے کہ ایسا انسان جو عمل بھی کرے گا۔ اُس میں وہ اِس بات کا خیال اور لحاظ رکھے گا۔ کہ مجھے اللہ تعالےٰ کی خوشنودی حاصل ہو۔ کوئی کام کرتے وقت وہ یہ بھی سوچے گا۔ کہ آیا جو کام مَیں کر رہا ہوں۔ وہ سمیع و علیم خُدا کو پسند بھی ہے یا نہیں)

(۱۱) جو کام بھی ہوتا ہے، خُدا کے فضل اور اُس کی عنایت سے ہوتا ہے۔ اگر کام کی بنیاد مجاہدہ پر ہوتی، تو شیطان راندۂ درگاہ خُداوندی ہرگز نہ ہوتا۔ (اِس اِرشاد میں حضرت داتا گنج بخشؒ نے مجاہدہ کی نفی نہیں کی۔ بلکہ یہ حقیقت آشکارا کی ہے، کہ

ہر حال میں ایک بندہ کی نظر خُدا کے فضل اور اُس کی عنایت پر رہنی چاہیئے۔ اس کے بغیر کوئی چوں شبک نہیں ملیٹھ سکتی۔ بندگی کا ثبوت دیئے بغیر اگر کوئی شخص یہ چاہتے کہ وہ اپنی عملی قوت سے کسی کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دے، تو یہ ناممکن ہے)

(۱۲) نفس کی خواہشات پر قابو پانا جنت کے دروازوں کی کُنجی ہے۔ نفس جتنا زیادہ کسی کے تابع ہوتا ہے۔ اُسی قدر عبادت آسان ہو جاتی ہے۔ (نیکی کا جذبہ اُبھرتا ہی اُس وقت ہے، جب انسان اپنے نفس پہ قابو پا لیتا ہے۔ جنت کے دروازے کیوں نہ کُھلیں اُن لوگوں کے لئے جنہوں نے اپنے مولا کی خوشنودی کی خاطر اپنے اُوپر راحت و آرام کے تمام دروازے بند کر دیئے ہیں)

(۱۳) نماز ایک ایسی عبادت ہے، کہ طالبانِ حق خواہ مبتدی ہوں خواہ منتہی، اُس کے ذریعہ فلاح کا راستہ پاتے ہیں۔ اُن کے مقامات بھی اُس کے ذریعے کھلتے ہیں (نماز چونکہ نیازمندی کا ایک عملی ثبوت ہے۔ اس لئے خداوندِ بے نیاز اُس کے صدقہ میں اپنے بندوں کو دین و دُنیا میں سرفراز و سربلند کر دیتا ہے)

(۱۴) روزہ باطنی عبادت ہے۔ ظاہر سے اس کا کوئی علاقہ نہیں۔ اللہ تعالےٰ کے ماسوا کوئی اس سے آگاہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی جزا بہت بڑی رکھی گئی ہے۔ (حدیثِ قدسی کا مضمون ہے کہ الصوم لی وانا اجزی بہ روزہ میرے لئے ہے۔ اور اس کی جزا میں خود دیتا ہوں۔ دُوسرے لفظوں میں روزہ میرے لئے ہے اور اس کی جزا میں خود ہوں)

(۱۵) زکوٰۃ دراصل اللہ تعالےٰ کی نعمتوں کا شکریہ ہے۔ جسم کے ہر عضو پہ زکوٰۃ واجب ہے۔ چاہیئے یہ کہ جسم کے سب اعضاء عبادتِ الٰہی میں مصروف رہیں۔

تاکہ زکوٰۃ کا حق ادا ہو۔ (زکوٰۃ ایک ڈھال ہے۔ جو ایک مسلمان کو نفس کی شرارتوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ اسلام کا یہ رکن بنی نوع انسان سے ہمدردی کی عملی تعلیم دیتا ہے اللہ تعالےٰ نے اپنے بندوں کو طرح طرح کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ یہ بے انصافی کی بات ہے، کہ ہم اُن کا شکریہ ادا نہ کریں۔ اُس نے ہمیں مہلت دی ہے۔ اس سے ہم غریبوں اور محتاجوں کی مدد کریں۔ اُس نے ہمیں صحت اور توانائی عطا کی ہے۔ اُس کی زکوٰۃ بھی نکالیں۔ اس زکوٰۃ کی نوعیت یہ ہو گی۔ کہ ہمیں اپنی صلاحیتیں راہِ مولا میں اُس کی خوشنودی کے لئے صرف کر دینی ہوں گی۔ آنکھ، ناک، کان، مُنہ وغیرہ کی بھی زکوٰۃ ہے۔ اور وہ یہ کہ ان سے ہم وہی کام لیں۔ جو کام قدرت نے اُن کے لئے متعیّن کیا ہے۔

(۱۶) صحت، عقل، بلوغ، اسلام اور استطاعت کی صورت میں ہم پر بیت اللہ شریف کا حج بھی فرض ہے۔ اہلِ تحقیق کے لئے مکّہ مکرّمہ کے راستے میں ہر قدم پر ایک نشانِ قدرت ظاہر ہے۔

(۱۷) جس کے دل میں خُداوند تعالےٰ کی محبت ہو۔ وہ اگر لوگوں سے میل جول بھی رکھے، تو اس سے اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ (مطلب یہ ہے کہ ایک عاشق کی نظر ہر حال میں اپنے محبوب کی خوشنودی پر رہتی ہے پرندہ (کبوتر وغیرہ) جو کسی کے گھر میں پلا ہوا ہے۔ اُس کی پرواز کتنی اونچی ہی کیوں نہ ہو پھر بھی اُس کی نظر اپنے نشیمن پر رہتی ہے ؎

تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں
آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں)

(۱۸) جو شخص صرف مخلوق کا دوست ہوتا ہے۔ اللہ کی دوستی کی اُسے ہوا بھی نہیں لگتی۔

(۱۹) جو شخص شریروں کی صحبت میں بیٹھتا ہے۔ وہ خود بھی شریر ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ نیک ہوتا، تو نیکوں کی صحبت اختیار کرتا۔

(۲۰) محبّت حال ہے، حال کبھی قال نہیں ہوتا۔ یعنی اگر کوئی زبردستی محبّت کرنا چاہے۔ تو یہ ناممکن ہے۔

(۲۱) بوڑھوں کو چاہیئے کہ وہ جوانوں کا پاس خاطر کریں۔ کیونکہ اُن کے گُناہ بہُت کم ہیں۔ اور جوانوں کو چاہیئے کہ وہ بوڑھوں کا احترام کریں۔ کیونکہ وہ اُن سے زیادہ عابد اور تجربہ کار ہوتے ہیں۔

(۲۲) اتنے علوم کا سیکھنا اور پڑھنا ضروری ہے۔ جن سے اعمال درست رہ سکیں۔ (ہر کام میں اوسط کا لحاظ رہے)

(۲۳) علم خواہ کتنا ہی تھوڑا کیوں نہ ہو۔ اُس کے ساتھ عمل بہت زیادہ ہونا چاہیئے۔

(۲۴) صحبت کی تاثیر تمام عادتوں کو بدل دیتی ہے۔ (بُروں کو چاہیئے کہ وہ نیکوں کی صحبت اختیار کریں)

(۲۵) غور و فکر اور تدبیر سے دل میں پاکیزگی آتی ہے۔ اور طہارت کے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں۔

(۲۶) آدمی جن لوگوں کی صحبت میں رہتا ہے اس پر ان کی عادات اور اُن کے اطوار کا عکس پڑ جاتا ہے۔

(۲۷) نافرمانی میں نافرمان کو ایک گھڑی بھر کے لیئے خوشی ہوتی ہے۔ اور فرمانبرداری سے دائمی خوشی حاصل ہوتی ہے۔

(۲۸) جو شخص نگاہِ عبرت سے اس جہاں کو دیکھتا ہے۔ اُسے یہ جہاں عجائب خانہ معلوم ہوتا ہے۔

(۲۹) جب طمع سے چھٹکارا مل جاتا ہے تو پھر ذلت بھی عزت بن جاتی ہے

(۳۰) محب اپنے تمام اوصاف کو محبوب کی محبت پر قربان کر دیتا ہے، گویا محبوب باقی رہتا ہے۔ اور محب فنا ہو جاتا ہے۔

(۳۱) جو خدا کے دوست ہیں۔ وہ اس کے احکام کی اتباع سے بے نیازی نہیں برتتے۔ احکام کے ادا کرنے میں جو تکلیف ہوتی ہے۔ اُس کا اُن پر اثر نہیں پڑتا۔ (تکلیف سے تو وہ گھبرائیں جو اس سے بیگانہ ہیں)

(۳۲) جب بندہ یہ جان لے، کہ اُس پر حق تعالےٰ کے بے اندازہ احسانات ہیں۔ تو اسے بے حد شکر گذار ہونا چاہیئے۔

(۳۳) نفس کی مخالفت کرنا تمام عبادتوں کا سرچشمہ ہے۔ (اس لئے کہ سارے گناہوں کی جڑ نفس کی پیروی ہے)

(۳۴) ناپاک کتا جب مجاہدہ کرتا ہے تو اُس کا شکار کیا ہوا جانور حلال ہو جاتا ہے۔ (اس سے مقصود یہ ہے کہ مجاہدہ سے آئینۂ دل پر جلا آتی ہے)

(۳۵) جب مجاہدہ کا سبب جمال الٰہی ہوتا ہے۔ تو مجاہدہ پر ہدایت سبقت لے جاتی ہے۔

(۳۶) ہر چند بات کرنا خداوند قدوس کی ظاہری نعمت ہے۔ مگر اس کی

آفت بھی بہت زیادہ ہے۔ جب اہلِ طریقت نے جان لیا، کہ بات چیت میں آفت ہے، تو انہوں نے بلا ضرورت گفتگو کرنی ہی چھوڑ دی۔

(۳۷) دوستی خدائے برتر کے لئے ہونی چاہیئے، نہ کہ نفس کی خواہش کے لئے۔

(۳۸) تصوّف اچھے اور پسندیدہ اخلاق کا نام ہے۔

(۳۹) بندہ اپنے تمام احوال میں خُداوند تعالےٰ کو کافی سمجھے یعنی اُس کی رضا میں راضی رہے۔

(۴۰) میرا مقصود کشفُ المحجوب کی تصنیف سے یہ ہے، کہ جس کسی کے پاس یہ کتاب ہو۔ اُسے کسی دوسری کتاب کی ضرورت نہ رہے۔

حضرت داتا گنج بخش رح کی وفات

جو پیدا ہوا ہے، اُس کے لئے فنا ضروری ہے۔ بقا تو صرف خُدا کی ذات کے لئے ہے۔ ہاں البتہ اہلِ اللہ پر اتنا کرم ضرور کیا گیا ہے۔ کہ انہیں عالم برزخ میں ایک ایسی حیات عطا کر دی جاتی ہے۔ جو اس فانی دُنیا کی حیات سے کہیں اونچی ہے۔ ان کے مزارات سے بھی فیوض و برکات کا سلسلہ اسی طرح قائم رہتا ہے۔ جس طرح ان کی حیات دنیاوی میں تھا۔ ان اولیاء اللہ کے مزارات سے آج بھی یہ آواز آ رہی ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت ست بر جریدۂ عالم دوامِ ما

حضرت داتا گنج بخشؒ کا وصال ۴۶۵ھ میں ہوا۔ آپ کا عُرس ہر سال ۱۹، ۲۰ صفر کو ہوتا ہے۔ دُور دُور کے لوگ زیارت کے لئے آتے ہیں۔ ہاں ہر جمعرات کو اتنا مجمع ہوتا ہے، کہ دُوسرے مزارات کے عُرسوں میں بھی اتنا مجمع نہیں ہوتا۔ رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں کوئی گھڑی ایسی نہیں، کہ مزارِ عالیہ کے گرد پروانوں کا ہجوم نہ ہو۔

سلاطین اور اولیاء اللہ کی زیارت گاہ

حضرت داتا گنج بخش رح کے مزار عالیہ پر جن بادشاہوں نے حاضری دی۔ اُن کے نام یہ ہیں:۔ (۱) سُلطان ابراہیم غزنوی۔ (۲) علاؤالدولہ مسعود کے امرا عضدالدولہ اور طغاتگین۔ (۳) سلطان الدولہ ارسلان شاہ سنہ ۵۱۰ھ۔ (۴) سلطان معزالدولہ سنہ ۵۱۱ھ۔ (۵) خسرو شاہ (۶) خسرو ملک (۷) اکبر (۸) جہانگیر (۹) شاہجہاں (۱۰) شہزادہ دارا شکوہ ان کے علاوہ غوری، خاندان غلاماں، سادات لودھی کے سلسلہ کے سلاطین نے بھی حضرت داتا گنج بخش رح کے مزار عالیہ پر حاضری دی ہے۔ جن فقراء نے وقتاً فوقتاً اس مزار عالیہ کی زیارت کی ہے۔ اُن کی فہرست بہت طویل ہے۔ چند مشہور فقراء کے نام یہ ہیں۔ (۱) خواجہ خواجگان حضرت معین الدین چشتی رح۔ (۲) حضرت بابا فرید شکر گنج رح (۳) حضرت میاں میر رح۔ (۴) حضرت لال حسین رح۔ (۵) حضرت شیخ حسو تیلی رح

خواجہ غریب نواز کا حجرۂ اعتکاف

خواجہ خواجگان حضرت معین الدین چشتی اجمیری رح ۵۸۰ھ یا اُس کے لگ بھگ

زمانے میں حضرت داتاؒ کے مزار عالیہ پر معتکف ہوئے۔ اسی زمانے میں صدر دیوان یعقوب زنجانیؒ سے بھی آپ کی ملاقاتیں ہوئیں۔ دربار داتاؒ کے سب سے پہلے سجادہ نشین حضرت شیخ ہندیؒ کے صاحبزادے شیخ لطفی (لطف اللہ) کو آپ سے کافی فیض پہنچا۔ حضرت خواجہ کی مدت اعتکاف چھ ماہ یا اس کے قریب بتلائی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت داتا گنج بخشؒ نے جب اعتکاف کے باوجود حضرت خواجہ کے حال پر توجہ نہیں فرمائی۔ تو آپ مایوس ہو کر رخصت ہو گئے تھے مزار کے احاطے سے باہر کچھ دور سڑک کے کنارے اُن کی باطنی ملاقات حضرت داتا گنج بخشؒ سے ہوئی۔ اور اُن کی منہ مانگی مراد مل گئی۔ فرط مسرت سے حضرت خواجہ پھر لوٹے۔ اور مزار عالیہ کے آستانے پر کھڑے ہو کر بکمال عقیدت یہ شعر پڑھا۔

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا

ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

یہ شعر آج بھی ہر شخص کی زبان پر ہے۔ گنج بخش حضرت داتا گنج بخشؒ کو اسی لئے کہتے ہیں، کہ حضرت خواجہؒ نے انہیں اسی لقب سے یاد کیا ہے۔ آخری چہار شنبہ کو (عرس کے بعد جو بدھ آتا ہے) حضرت خواجہ فیض یاب ہوئے تھے۔ اس لئے اُس دن بھی مزار عالیہ پر کافی چہل پہل اور رونق ہوتا ہے۔ اندرون آستانہ نعت خوانی اور باہر قوالی ہوتی ہے۔ شہر سے موتیوں کے سہرے لوگ بڑی عقیدت سے لاتے اور حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار پر چڑھاتے ہیں۔

قطعہ تاریخ وفات

این روضہ کہ بانیش شدہ فیض است
مخدوم علی راست کہ با حق پیوست
در ہستیٔ ہست نیست شد ہستی یافت
زاں سال وصالش افضل آمد از ہست

۴۶۵ھ

یہ قطعہ تاریخ بھی حضرت خواجہ غریب نواز سے منسوب ہے۔

اردو پریس ۸۸ میکلوڈ روڈ لاہور میں باہتمام آغا شورش کاشمیری پرنٹر و پبلشر چھپکر مکتبہ چٹان
۸۸ میکلوڈ روڈ لاہور سے شائع ہوئی ؛